نوعیت کی منفرد کتاب
دینی
عملیات
امتیاز احمد سعید
مجید بک ڈپو
بھوانہ بازار لائلپور

# دینی تعلیمات

## حصہ اوّل

برائے

طلبہ انٹرمیڈیٹ سال اوّل

از

امتیاز احمد سعید، ایم اے (علوم اسلامیہ) ایم اے (عربی) جے ڈی، پی ای ایس
شعبہ علوم اسلامیہ گورنمنٹ کالج لاہور
وپارٹ ٹائم لیکچرار، شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

حمید بُک ڈپو
ہیڈ آفس بھوانہ بازار لائلپور
برانچ ـــ اردو بازار لاہور

طبع ——— اول
تعداد ——— ایک ہزار
ناشر : افتخار احمد : مجید بک ڈپو
ہیڈ آفس : جھوانہ بازار لائل پور
برانچ : اردو بازار لاہور
مصنف ——— امتیاز احمد سعید : ایم اے (علوم اسلامیہ)
ایم اے (عربی) جے ڈی، پی ای ایس I
مطبع ——— پنجاب پرنٹنگ پریس لاہور
قیمت ——— ۲۵/۳ روپے

# تعارف

برصغیر کے تمام تعلیمی اداروں میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے کالجوں اور سکولوں کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ یہاں ابتدا ہی سے "دینی تعلیم" کا باقاعدہ انتظام رہا ہے۔ ان اداروں میں دینیات کا لازمی مضمون اس وقت بھی پڑھایا جاتا تھا جبکہ یہاں انگریز کی حکمرانی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد بھی جبکہ اسلامیات کا مضمون ابھی اس ملک میں شروع نہیں ہوا تھا۔ انجمن کے تعلیمی اداروں میں یہ باقاعدہ رائج تھا۔ اور اب بھی "دینی تعلیمات" کا لازمی مضمون بدستور چلا آتا ہے۔

خوش قسمتی سے میری تعلیم و تربیت بھی انجمن کی انہی درسگاہوں کی مرہون منت ہے اور اس مضمون سے خاص لگاؤ ہونے کی بنا پر مجھے یہ خیال ہوا کہ اس کے لیے کتاب مرتب کروں۔ چنانچہ زیر نظر کتاب اسی فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب کوئی بڑی علمی کاوش نہیں بلکہ محض طلبہ کی سہولت کے لیے معلومات کا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے۔

امید ہے اساتذہ کرام اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے اور عزیز طلبہ بھی اس سے استفادہ کریں گے۔ رب العزت اسے شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آمین!

۱۴ اگست ۱۹۸۱ء — امتیاز احمد سعید

# نصاب

# دینی تعلیمات

برائے

طلبہ انٹرمیڈیٹ

(الف) (۱) ایمان اور کفر، ارکان اسلام

اخلاق و آداب -

(۲) حقوق و فرائض

(ا) والدین اور اولاد

(ب) رشتہ دار

(ج) ہمسایہ

(د) استاد و شاگرد

(ہ) شہری

(ب) پارہ عم ربع آخر (ترجمہ و تشریح)

# فہرست مضامین

باب ۱
ایمان
کفر

# ایمان

**مفہوم** "ایمان" کے لغوی معنی جاننا، ماننا، تصدیق کرنا اور یقین کرنا ہے۔ اصطلاح شریعت میں "ایمان" سے مراد خدا تعالیٰ کی ہستی اور اس کے بتائے ہوئے اصولوں کو ماننا ہے۔ ایمان کا تعلق صرف زبان سے نہیں بلکہ دل سے بھی ہے قول کے ساتھ فعل بھی اسی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ایمان کی تعریف یہ ہے "اِقرارٌ باللسان وتصدیق بالقلب" زبان سے اقرار کرنا اور دل سے اسکی تصدیق کرنا ہے

**اجزائے ایمان** قرآن و احادیث میں ایمان کے پانچ اجزا بیان ہوئے ہیں جنہیں عقائد اسلام، اصُول خمسہ، اور اصول دین، بھی کہتے ہیں۔ ان پانچ اجزائے ایمان کا زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق ہر مسلمان کے لیے لازمی ہے تفصیل یہ ہے۔

(۱) اللہ پر ایمان:۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اور معبود تسلیم کرنا اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرانا۔

(۲) فرشتوں پر ایمان:۔ یعنی اس نورانی مخلوق کو تسلیم کرنا جو اللہ کے حکم سے نظام کائنات میں اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔

(۳) رسولوں پر ایمان:۔ یعنی اللہ کے ان پیغمبروں کو ماننا جو اللہ نے بنی نوع انسان کی ہدایت و رہبری کیلئے وقتاً فوقتاً بھیجے اور ان سب کے آخر میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔

(۴) کتابوں پر ایمان:۔ یعنی ان الہامی کتابوں کو ماننا جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے اپنے رسولوں پر نازل کیں اور ان سب میں آخری مکمل اور محفوظ

کتاب قرآن حکیم ہے جسے حضورؐ پر نازل کیا گیا۔

(۵) **یوم آخرت پر ایمان**:۔ یعنی اس دن کو تسلیم کرنا جس روز یہ سب دنیا فنا ہو جائے گی۔ ہر شخص کو اس کا نامۂ اعمال دیا جائیگا اور اسی کے مطابق اسے جزا و سزا ملے گی۔

**اہمیت** ایمان انسان کے تمام اعمال کی اساس اور بنیاد ہے اور ہماری سیرابی کا اصل سرچشمہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعمال کا دار و مدار نیتوں پر رکھا ہے۔ گویا کوئی بھی عمل خواہ بظاہر کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس وقت تک قابل قبول نہیں جب تک کرنے والے کی نیت درست نہ ہو۔

نیک نیتی کو دوسرے لفظوں میں ایمان کہا جا سکتا ہے اور جس شخص میں ایمان نہیں اس کے اعمال روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص دکھاوے کے لیے نماز ادا کرتا ہے تو اس کو ہرگز کوئی ثواب واجر نہیں ملے گا۔ قرآن پاک میں ایسے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اپنی نمازوں میں دکھاوا کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص زکوٰۃ صرف اس لیے دیتا ہے کہ اسے شہرت حاصل ہو تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس کا تمام صدقہ ضائع جائے گا۔

قرآن پاک نے اسی لیے ایمان کو اعمال کا دیباچہ قرار دیا ہے اور ایمان کا ذکر ہمیشہ عمل صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور پر کیا ہے کیونکہ ایمان کے نہ ہونے سے دل کی نیک نیتی کا بھی عدم ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی علم و عمل، تصور و فعل اور ایمان و اعمال کو ایک دوسرے کا نتیجہ اور باہم ناگزیر قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان کے بغیر عمل صالح وجود میں ہی نہیں آسکتا۔

قرآن حکیم میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کو اس کثرت سے بیان کیا گیا ہے کہ کسی اور بات کا اتنا ذکر نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ جو شخص اللہ اور آخرت پر یقین رکھے گا وہ نیک نیت اور عمل کا کھرا ہو گا۔ وہ ہر وقت اللہ کی رضا چاہے گا۔

اور اپنے اعمال کی جواب دہی کا احساس رکھے گا للذا وہ اچھے اعمال کرے گا فرشتوں پر ایمان لانے سے کفر و شرک کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔ رسولوں اور الہامی کتابوں پر ایمان ایک عالمگیر برادری کا تصور پیدا کرتا ہے۔ اس طرح جو شخص اسلام کے ان عقائد پر ایمان رکھتا ہے اس کی زندگی اعمال صالح سے مالا مال ہو جاتی ہے۔

ایمان صرف اخلاق حسنہ اور اعمال صالح کا ہی پیش خیمہ نہیں بلکہ اس سے انسان میں وہ قوت بھی پیدا ہوتی ہے کہ وہ دنیاوی اسباب و وسائل کو بہترین طریقے پر استعمال میں لائے اور دنیاوی ترقی حاصل کرے۔ اسلامی نظام میں ایمان کی حیثیت صرف ایک مذہبی عقیدے کی نہیں بلکہ اس پر افراد کے اخلاق و کردار کی عمدگی، معاملات کی درستی، تہذیب و تمدن کی ترقی اور معاشرت و سیاست کے استحکام کا بھی انحصار ہے۔ مختصر یہ کہ ایمان کا عدم، اسلام کا عدم ہے۔ ایمان کا ضعف اسلام کا ضعف ہے۔ اور ایمان کی قوت اسلام کی قوت ہے۔

## ایمان کی خصوصیات

دین اسلام میں جس ایمان کا متقاضی ہے اس کی خصوصیات یہ ہیں :-

۱- ایمان و اسلام اور کفر کے درمیان حد فاصل ہے۔ ایمان لانے والا دائرہ اسلام میں داخل ہے اور ایمان نہ لانے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

۲- ایمان عمل کی جڑ ہے۔ اسلام کی نگاہ میں صرف وہی عمل قدر و قیمت اور وزن رکھتا ہے جس کی بنیاد ایمان پر ہو اور جہاں یہ بنیاد نہ ہو وہاں تمام اعمال بے معنی ہوتے ہیں۔

۳- ایمان نظام اسلام کا سنگِ بنیاد ہے اور اسلامی نظام کی عمارت اسی پر قائم کی گئی ہے۔ اس لیے اسلام کے ضعف و استحکام کا انحصار ایمان کی کمزوری و مضبوطی پر ہے۔

# ۲۔ کفر

**مفہوم** کفر کے لغوی معنی چھپانا ڈھانپنا اور انکار کرنا ہے۔ اصطلاح شریعت میں کفر سے مراد یہ ہے کہ جب کسی شخص کے سامنے اسلام پیش کیا جائے تو وہ جاننے کے بعد بھی ایمان نہ لائے یا ماننے سے انکار کر دے۔ یہ اسلام اور ایمان کی ضد ہے۔

**کفر کی حقیقت** کفر سب سے بڑی جہالت ہے جو انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے اور وہ اصل حقائق کو نہیں پہچان سکتا۔ کافر بھی اللہ کی مخلوق ہے۔ اللہ نے اسے پیدا کیا، زندگی کی سب نعمتیں عطا کیں اور ہر طرح کے احسانات کئے لیکن وہ اللہ کا انکار کر کے سب سے بڑی ناشکری کا اظہار کرتا ہے۔ وہ پھر بھی اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا بلکہ خود اپنے آپ پر ہی ظلم کرتا ہے۔ اس کے اچھے کاموں کا بھی آخرت میں کوئی اجر نہیں دیا جائے گا۔ بلکہ اس کا انجام جہنم کا عذاب ہوگا۔

**کفر کی صورتیں** کفر کی متعدد صورتیں ہیں جن میں سے (۱) شرک (۲) نفاق سب سے زیادہ خطرناک ہیں۔

(۱) **شرک**:۔ شرک کے معنی شریک کرنا ہے۔ اصطلاح میں اسی سے مراد خدا تعالیٰ کی ذات وصفات اور احکام میں کسی دوسرے کو شامل کرنا ہے۔ بت پرست، مظاہر پرست آتش پرست وغیرہ سب اسی ضمن میں آتے ہیں۔ مشرک اللہ کا باغی ہے اور اللہ تعالیٰ اسے ہرگز نہیں بخشے گا اور جہنم کا مستقل عذاب اس کی سزا ہے۔

(۲) **نفاق**:۔ نفاق دورخی اور دل کی کھوٹ کو کہتے ہیں یعنی جس کے ظاہر و باطن میں

فرق ہو یا قول و فعل میں مطابقت نہ ہو بلکہ مسلمانوں کو دھوکا دینے، اسلام کو نقصان پہنچانے یا دنیاوی جاہ و منصب کے لیے بظاہر کلمہ پڑھتا ہو اور دل سے خدا اور رسولؐ پر یقین نہ رکھتا ہو منافق ہے۔ منافق کی سزا آخرت میں "دردناک عذاب" ہے۔

باب ۲

# ارکانِ اسلام

- شہادت توحید و رسالتؐ
- نماز
- روزہ
- زکوٰۃ
- حج

# ارکان اسلام

ارکان جمع ہے "رکن" کی جس کے معنی ہیں ستون یا تھم ۔ ارکان اسلام وہ ستون ہیں جن پر اسلامی زندگی کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے، جو یہ ہیں: (۱) شہادت توحید و رسالتؐ (۲) نماز (۳) روزہ (۴) زکوٰۃ اور (۵) حج ۔

اسلام دراصل ایمان اور عمل کے مجموعے کا نام ہے ۔ عقائد اسلام پر ایمان لانے کے بعد اسلام کی عملاً اطاعت لازم ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ کسی چیز پر ایمان لانے کے بعد اس پر عمل پیرا ہونا دراصل اس کا پایۂ تکمیل ہے ۔ بلکہ ایمان اور عمل کا اتنا گہرا ربط ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا اسی طرح محال ہے جس طرح شعلے سے روشنی کو ۔ ایمان کا ظاہری ثبوت بھی اعمال ہی سے مل سکتا ہے ۔ اعمال کی واضح صورت وہ عبادات ہیں جنہیں 'ارکان اسلام' کہا جاتا ہے ۔

ارکان اسلام، دین اسلام کے عظیم الشان محل کے لیے ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوةِ وَحَجِّ الْبَیْتِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ

(اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا)

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اسلام کو ایک عمارت یا محل سے تشبیہ دے کر ارکان اسلام کی اہمیت کو یوں واضح کیا ہے کہ جس طرح ایک عمارت کی

پختگی و مضبوطی، استواری و پائیداری اور قیام و بقا کا انحصار اس کی دیواروں اور ستونوں پر ہوتا ہے بعینہ اسلام کا سارا نظام زندگی بھی ان پانچ بنیادی ارکان پر قائم ہے۔ اگر کسی عمارت کی دیواروں یا ستونوں میں سے ایک گر جائے یا کمزور ہو جائے تو عمارت کے اس حصے کے گرنے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ گویا کسی عمارت کی پختگی اور پائیداری کا انحصار اس کے ستونوں کی مضبوطی پر ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلام کی تقویت کا دار و مدار انہی ارکان اسلام پر ہے۔

اسلام کی عمارت کے ان ستونوں کو مضبوط و پختہ رکھنے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ ان سے بے نیاز اور بے رخ ہو کر انسان اسلام کے دیگر احکام و اعمال کو عملی جامہ پہنانے میں کبھی ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسلامی زندگی کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اخلاقی اور روحانی تمام پہلوؤں کا انحصار انہی ارکان اسلام پر ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ایک مسلمان سب سے پہلے انہی کو اپنی زندگی میں نافذ کرنے کی کوشش کرے۔

## شہادت توحید و رسالت

**مفہوم** اسلام کا پہلا اور اہم ترین رکن شہادت توحید و رسالت ہے جس کے معنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا زبان اور دل سے اقرار کرنا ہے۔ اسے کلمہ طیبہ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد اللہ کے رسول ہیں) اور کلمہ شہادت، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں) بھی کہتے ہیں۔

**حقیقت** "شہادت توحید و رسالت" بظاہر بہت آسان بات ہے کہ ذرا سی زبان ہلا کر ادا کر دیا مگر فی الحقیقت یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری کی قبولیت کا اعتراف اور اس کا عملی اظہار ہے۔ شہادت یا گواہی ایک عملی چیز ہے جو کسی بات کے جتانے یا منانے کو دی جاتی ہے۔ اسی لیے شہادت توحید و رسالت کا اقرار اس بات کی دلیل ہے کہ پڑھنے والا عملاً اپنا تن من دولت ہر چیز اللہ کی راہ میں قربان کرنے کو تیار ہے۔ اسی بنا پر "شہادت توحید و رسالت" کو ارکان اسلام میں رکھا گیا ہے۔

کلمہ طیبہ یا کلمہ شہادت میں دو باتوں کی گواہی ہے ایک اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، الوہیت اور وحدانیت اور دوسرے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت۔ پانچ اجزائے ایمان میں سے فقط ان دو کی عملی شہادت کے لازم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں آخری مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ لیکن اللہ کی پہچان چونکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہوئی لہٰذا حضورؐ کی رسالت کی گواہی بھی توحید باری تعالیٰ کے ہمراہ لازم ٹھہری۔

**اہمیت** شہادت توحید و رسالت کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے ارکان اسلام میں سب سے اوّل رکھا گیا ہے اور اسے تسلیم کیے بغیر کوئی شخص اسلام میں داخل نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ "شہادت توحید و رسالت" اسلام کا اولین بنیادی اور مرکزی رکن ہے اور اسلام کے جملہ عقائد و اعمال کو حاوی ہے۔ ذرا غور کیجئے اگر کوئی شخص سرے سے خدا اور رسولؐ کو ہی تسلیم نہ کرتا ہو یا محض زبان سے اقرار کرتا ہو اور عملاً اطاعت نہ بجالاتا ہو تو پھر اس کے باقی اعمال کی حیثیت کیا ہو گی؟ یقیناً اس کی نیکیاں بے حقیقت ہو کر رہ جائیں گی۔ آخرت میں اسے کوئی اجر نہیں ملے گا۔

شہادت توحید و رسالت ایمان اور کفر کے درمیان ایک ایسی حد فاصل ہے کہ

اس کا اقرار کرنے والا امت مسلمہ کا رکن بن جاتا ہے اور اس کا منکر کافروں میں شمار ہوتا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی آدمی کلمہ پڑھ لے اور بتوں کا منکر ہو جائے تو اس کی جان اور مال دوسرے مسلمانوں پر حرام ہو جاتی ہے اس کے اعمال کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ یہ حکم اس حد تک ہے کہ اگر میدان جنگ میں بھی دشمن کلمہ کا اقرار کر لے تو وہ مسلمان متصور ہوگا۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی صحابیؓ نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ اگر کوئی کافر دوران جنگ میرا ہاتھ کاٹ کر درخت کی اوٹ میں آ کر یہ کہہ دے کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے تو کیا میں اسے پھر قتل کر سکتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ صحابیؓ نے عرض کیا اس کافر نے کلمہ پڑھنے سے پہلے میرا ہاتھ کاٹا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اسے قتل مت کرو اور اگر تم نے ایسا کیا تو وہ درجہ اسے مل جائیگا جس میں تم اسے کے قتل سے پہلے تھے اور اس کا درجہ تمہیں ملے گا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شہادت توحید و رسالتؐ کا اقرار انسانی زندگی میں کیا تبدیلی پیدا کرتا ہے۔

احادیث سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جس شخص نے توحید و رسالت کا اقرار کر کے دل سے اس کی تصدیق و تائید کی اور اس کے تقاضوں پر عمل پیرا ہوا وہ جنت کا حق دار ہوگا۔

## ۲۔ نماز

**مفہوم** نماز اسلام کا دوسرا رکن ہے۔ قرآن پاک میں نماز کے لیے لفظ "صلوٰۃ" وارد ہوا ہے جس کے معنی دعا اور بندگی کے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں "دعا" سے مراد وہ بدنی عبادت ہے جو ہر عاقل و بالغ مسلمان پر اللہ تعالیٰ کیلئے دن میں پانچ مرتبہ لازم آتی ہے۔ نماز بجا لانے کے لیے قرآن پاک میں لفظ "اقامت" استعمال ہوا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ نماز کو تمام ارکان و شرائط کے ساتھ صحیح

وقت پر صحیح طور سے ادا کیا جائے۔

**اہمیت** | نماز اسلام کا اہم ترین فریضہ اور سب سے بڑی عبادت ہے۔ قرآن واحادیث میں جس قدر نماز کی تاکید آئی ہے کسی اور شے کی نہیں۔

نماز کی اہمیت و فضیلت کے مندرجہ ذیل پہلو ہیں :-

۱- **نماز کا اہم کردار** :- نماز بے شمار انفرادی و اجتماعی ضروریات کی حامل ہے۔ نماز انسان کے ذہن میں اس بات کو تازہ رکھتی ہے کہ وہ دنیا میں خود مختار نہیں بلکہ اللہ رب العالمین کا بندہ ہے اور اسی کے حکم کے مطابق اسے زندگی بسر کرنا ہے اس سے انسان شیطان کے بہکانے سے بچا رہتا ہے اور سیدھی راہ پر چل کر زندگی بسر کرتا ہے۔ نماز کا دوسرا کام یہ ہے کہ یہ انسان میں فرض شناسی اور مستعدی پیدا کرتی ہے۔ بیماری، سفر اور جنگ ہر حالت میں نماز کو پابندی کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے۔ اس سے انسان میں شیطانی قوتوں سے برسر پیکار رہتے ہوئے حدود اللہ کی حفاظت کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نماز کا تیسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ انسانی سیرت کو ایک خاص نہج پر تیار کرتی ہے اور روح کی تربیت اور کردار کی تعمیر کا موجب بنتی ہے۔ نماز کا ایک ایک فعل اور ایک ایک قول ایسا ہے کہ اس سے انسان کی سیرت خود بخود اسلام کے سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نماز انسان میں ضبط نفس کی قوت بھی پیدا کرتی ہے۔ نماز میں دعاؤں اور تسبیحوں کے ساتھ اوقات کی پابندی، طہارت کی شرائط اور جسمانی حرکات کا جوڑ اسی لیے ہے کہ انسان ضبط نفس کی تربیت حاصل کرے اور نفس کو رضائے الٰہی کے تابع کرے تاکہ قربت الٰہی حاصل ہو کر روح کی بالیدگی اور قلب کی پاکیزگی کا موجب بنے۔

ان انفرادی فوائد و ثمرات کے علاوہ نماز ہماری اجتماعی زندگی میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اور اجتماعی نظام کا پورا ڈھانچہ مرتب کرتی ہے۔ اس سے

اخوت، مساوات، اطاعت امیر اور اتحاد کی اجتماعی تربیت حاصل ہوتی ہے اور یہ زندگی میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کرتی ہے۔

۲۔ قرآن پاک کی تاکید:۔ قرآن پاک میں نماز کی جابجا تاکید آئی ہے اور کم و بیش سات سو مقامات پر اس کا ذکر ہوا ہے۔ ایک جگہ مسلمانوں کو نماز کا اس طرح حکم دیا گیا ہے:۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (روم) — (نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو)

ایک دوسرے مقام پر یہ حکم دیا گیا ہے:۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (البقرہ) — (صبر اور نماز سے استعانت حاصل کرو)

ایک مقام پر نمازوں کی نگہداشت کا یوں حکم دیا گیا ہے:۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (البقرہ) — (سب نمازوں کی حفاظت کرو اور خاص کر درمیانی نماز کی اور اللہ کے سامنے ادب سے کھڑے ہو جاؤ)

ایک جگہ نماز کی فرضیت کا یوں بیان ہوا ہے:۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (النساء) — (بیشک نماز مسلمانوں پر اپنے مقررہ وقتوں پر فرض ہے)

ایک مقام پر نماز کی افادیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت) — (اور نماز قائم کر۔ بیشک نماز بے حیائی اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے)

۳۔ احادیث نبوی:۔ احادیث نبویؐ میں بھی نماز کی بہت فضیلت بیان ہوئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ کا فرمان ہے:۔ اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ (نماز دین کا ستون ہے)

ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ "نماز آنکھوں کی ٹھنڈک ہے"۔ حدیث نبویؐ ہے کہ "کفر اور ایمان کے درمیان حدِ فاصل صرف نماز ہے"۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "جس نے نماز کو عمداً ترک کیا وہ کافر ہوگیا"۔

ایک شخص نے بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! میں نے ایک بڑا جرم کیا ہے۔ آپؐ نے اسے باجماعت نماز ادا کرنے کا حکم فرمایا اور بعد میں اس سے آپؐ نے فرمایا کہ "اللہ نے تیرے گناہ کو معاف فرمادیا ہے"۔ ایک جگہ نماز کی فضیلت کو ایک تمثیل کے ذریعے یوں بیان فرمایا کہ اگر کسی آدمی کے گھر کے متصل نہر بہہ رہی ہو اور وہ دن میں پانچ مرتبہ اس میں نہائے تو اس کے جسم پر کوئی میل باقی نہ رہے گی۔ یہی کیفیت پانچ نمازوں کی ہے۔ نیز آپؐ کا ارشاد ہے کہ نماز پنجگانہ سے گناہ اس طرح معاف ہو جاتے ہیں جس طرح موسم خزاں میں درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ پانچوں نمازیں جمعہ سے جمعہ تک، رمضان سے رمضان تک صغیرہ گناہوں کو محو کر دیتی ہیں جبکہ ان کے دوران کبیرہ گناہ نہ کئے جائیں۔

## اوقات و رکعات نماز

نماز دن میں پانچ مرتبہ فرض ہے۔ مختلف نمازوں کے اوقات اور رکعتیں حسب ذیل ہیں :-

(۱) نماز فجر :- اس نماز کا وقت صبح صادق سے طلوع آفتاب تک ہے اور اس کی کل چار رکعتیں ہوتی ہیں، پہلے دو سنتیں اور پھر دو فرض۔

(۲) نماز ظہر :- یہ نماز دوپہر کو سورج ڈھلنے سے اس وقت پڑھی جا سکتی ہے جب کسی چیز کا سایہ اس کے اپنے قد سے دوگنا ہو جائے۔ اس کی کل بارہ رکعتیں ہوتی ہیں۔ پہلے چار سنتیں، پھر چار فرض پھر دو سنتیں اور آخر میں دو نفل۔

(۳) نمازِ عصر:- یہ نماز سہ پہر کو ظہر کا وقت ختم ہونے سے اس وقت تک پڑھی جا سکتی ہے جب سورج غروب ہونے سے پہلے اس کی سُرخی باقی ہو۔ اس کی کل آٹھ رکعتیں ہیں۔ پہلے چار سنتیں پھر چار فرض۔

(۴) نمازِ مغرب:- یہ نماز غروبِ آفتاب کے فوراً بعد پڑھی جاتی ہے اور اس میں کل سات رکعتیں ہیں۔ پہلے تین فرض پھر دو سنتیں اور آخر میں دو نفل۔

(۵) نمازِ عشاء:- یہ نماز غروبِ آفتاب کے بعد خوب اندھیرا چھا جانے سے صبح صادق سے پہلے تک ہے۔ اس کی کل سترہ رکعتیں ہیں۔ پہلے چار سنتیں پھر چار فرض۔ پھر دو سنتیں پھر دو نفل اس کے بعد تین وتر اور آخر میں دو نفل۔

## شرائطِ نماز

نماز سے قبل بعض باتوں کی تکمیل ضروری ہے۔ انہیں شرائطِ نماز کہتے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) بدن کا پاک ہونا (۲) لباس کا پاک ہونا (۳) نماز پڑھنے کی جگہ کا پاک ہونا

(۴) ستر ڈھانپنا (۵) نماز کا وقت ہونا (۶) قبلہ رُخ ہونا۔

(اگر بحالتِ مجبوری ان میں سے کوئی شرط پوری نہ کی جا سکے تو بھی نماز ادا کرے)

## ترکیبِ نماز

اول وضو کرے پھر مسجد میں یا کسی پاک جگہ پر قبلہ رُخ ہو کر نماز کی نیت کرے اور دونوں ہاتھوں کو کانوں کی لو تک لے جائے اور تکبیر یعنی اللہ اکبر کہہ کر ناف پر اس طرح ہاتھ باندھ لے کہ دایاں اوپر ہو اور بایاں نیچے۔ اس کے بعد ثناء (سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ ..... الخ) اور تعوذ (اعوذ باللہ .....) اور تسمیہ (بِسْمِ اللّٰهِ .....) پڑھے۔ پھر سورۃ فاتحہ (اَلْحَمْدُ .....) کے بعد قرآن پاک کی کوئی دوسری سورۃ یا چند آیات تلاوت کرے اس کے بعد تکبیر کہہ کر رکوع کرے یعنی اس طرح جھک جائے کہ سر اور کمر برابر ہوں اور ہاتھوں سے گھٹنے پکڑے پھر تین یا پانچ یا سات بار سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم پڑھے اور

سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کہتا ہوا سیدھا کھڑا ہو جائے۔ پھر تکبیر کہتا ہوا اس طرح سجدے میں جائے کہ پہلے گھٹنے زمین پر رکھے پھر دونوں ہاتھ اس کے بعد سر اور ناک۔ سجدہ میں تین، یا پانچ یا سات مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی پڑھے اور اللہ اکبر کہتا ہوا دو زانو بیٹھ جائے پھر تکبیر کہہ کر دوسرا سجدہ کرے اور پھر تکبیر کہہ کر کھڑا ہو جائے اور پہلی رکعت کی طرح دوسری رکعت پڑھے مگر دونوں سجدوں کے بعد دو زانو بیٹھ جائے اور تشہد (التحیات ......) پڑھے۔

اگر نماز دو رکعتی ہو تو تشہد کے بعد درود اور دعا پڑھ کر دائیں بائیں سلام کہے اور نماز ختم کر دے اور اگر نماز تین یا چار رکعتی ہو تو التحیات پڑھ کر کھڑا ہو جائے اور باقی رکعتیں پوری کر کے درود، دعا اور سلام کے ساتھ نماز ختم کر دے۔

**ارکانِ نماز** وہ باتیں جن کی نماز کے اندر تکمیل ضروری ہے اور جن کے بغیر نماز نامکمل رہتی ہے۔ انہیں فرائض نماز بھی کہتے ہیں جو حسب ذیل ہیں

(۱) تکبیر تحریمہ یعنی نیت کرتے وقت اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کرنا (۲) قیام یعنی نماز کو کھڑے ہو کر ادا کرنا (۳) قرأت یعنی سورۃ فاتحہ کے بعد کوئی سورۃ یا آیت پڑھنا (۴) رکوع یعنی اس طرح جھکنا کہ سر اور کمر برابر ہوں اور ہتھیلیوں سے گھٹنے پکڑے ہوں۔ (۵) سجدہ یعنی دونوں ہتھیلیاں اور سر زمین پہ اس طرح رکھنا کہ سر ہاتھوں کے درمیان ہو (۶) قعدہ اخیر یعنی نماز کی آخری رکعت کے آخر میں بیٹھ کر تشہد اور درود شریف پڑھنا اور سلام پھیرنا۔

**واجبات نماز** وہ باتیں جن کے چھوٹ جانے سے سجدہ سہو لازم آتا ہے اور سجدہ سہو ادا نہ کیا جائے تو نماز نہیں ہوتی۔ واجبات نماز یہ ہیں۔

(۱) فرض نمازوں کی پہلی دو رکعتوں میں قرأت (۲) فرض کے علاوہ تمام نمازوں کی جملہ رکعتوں میں قرأت (۳) قرأت میں اول سورۃ فاتحہ بعد میں کوئی دوسری سورۃ

یا آیت پڑھنا (۴) پہلے رکوع کرنا بعد میں سجدہ کرنا (۵) قومہ یعنی رکوع کے بعد کھڑا ہونا (۶) جلسہ یعنی دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا (۷) نماز کے تمام ارکان بالترتیب ادا کرنا (۸) قعدۂ اولیٰ یعنی تین یا چار رکعتوں والی نماز میں دو رکعتوں کے بعد بیٹھنا۔ (۹) دوسرے قعدہ میں بھی تشہد پڑھنا (۱۰) امام ہونے کی صورت میں فجر، مغرب عشاء، جمعہ، عیدین، تراویح اور رمضان کے وتروں کی قرآت بآواز بلند کرنا۔ (۱۱) سلام کے ساتھ نماز ختم کرنا (۱۲) وتروں میں تکبیر کہہ کر دعائے قنوت پڑھنا۔ (۱۳) عیدین میں زائد تکبیریں کہنا۔

## فوائد و ثمرات

نماز بے شمار فوائد و ثمرات کی حامل ہے۔ جن میں سے بعض یہ ہیں۔

۱۔ انفرادی حیثیت سے انسان کی سیرت کی تعمیر اور شخصیت کی تشکیل کرتی ہے اس میں احساس ذمہ داری کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ ضبط نفس اور پابندی وقت کی تربیت دیتی ہے۔ فحش اور بے حیائی کی باتوں سے بچاتی اور اخلاق کی اصلاح کرتی ہے اور انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہے۔

۲۔ اجتماعی حیثیت سے افراد قوم میں نظم و ضبط، ہم آہنگی و یک جہتی، اتحاد و اتفاق، اخوت و مساوات پیدا کر کے ملت اسلامیہ کے افراد کو ایک مرکز پر مجتمع کرتی ہے۔

۳۔ نماز بندے کا اپنے معبود حقیقی سے براہ راست تعلق قائم کر کے اسے روحانی بالیدگی اور پاکیزگی نفس مہیا کرتی ہے۔ جس سے وہ رضائے باری تعالیٰ کے حصول کے ساتھ جنت کا حق دار ٹھہرتا ہے۔

# ۳۔ روزہ

**مفہوم** روزہ اسلام کا تیسرا رکن ہے۔ عربی زبان میں روزے کو "صوم" کہتے ہیں جس کی جمع "صیام" ہے۔ صوم کے لغوی معنی چپ رہنا، اپنے آپ کو روکنا اور باز رہنا ہے۔ اصطلاح شریعت میں روزہ صبح صادق سے غروب آفتاب تک تمام کھانے پینے اور شہواتی خواہش کی تکمیل سے باز رہنا ہے ہر عاقل بالغ مسلمان پر پورے ماہ رمضان کے روزے فرض ہیں۔

**اہمیت و فضیلت** روزہ ایک اہم اسلامی عبادات ہے، اس کی اہمیت درج ذیل ہے :۔

**۱۔ روزے کا اہم کردار** :۔ روزہ محض بھوکے پیاسے رہنے کا نام نہیں بلکہ نماز کی طرح روزہ بھی انسان کی زندگی پر بیشمار انفرادی اور اجتماعی اثرات پیدا کرتا ہے۔ روزے سے انسان میں خداتعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کا جذبہ بڑھ جاتا ہے کیونکہ انسان اور دنوں کی نسبت روزے میں خدا کی عبادت نسبتاً زیادہ کرتا ہے اور اس کے احکام کی زیادہ سے زیادہ پابندی کرتا ہے۔ پھر روزہ دار محض کھانا پینا اور نفسانی خواہشات کو ہی ترک نہیں کرتا بلکہ جھوٹ فریب لڑائی جھگڑا اور ہر طرح کے فسق و فجور سے اجتناب کرتا ہے اس طرح ضبط نفس روحانی بالیدگی اور قلبی پاکیزگی حاصل ہو کر اس کی سیرت و کردار کی تعمیر ہوتی ہے

روزوں کے لیے چونکہ رمضان المبارک کا ایک مہینہ مقرر ہے لہذا اس سے امت مسلمہ کے افراد کو وحدت و یگانگت، رفاقت و یکجہتی اور اخوت و مساوات کے اجتماعی فوائد حاصل ہوتے ہیں لیکن سب سے بڑا اجتماعی فائدہ یہ ہے کہ اس سے امداد باہمی کی روح بیدار ہوتی ہے اور عملی ہمدردی کا جذبہ ابھرتا

ہے کیونکہ روزہ چند گھنٹوں کے لیے امیر پر بھی وہ کیفیت طاری کر دیتا ہے جو اس کے فاقہ کش بھائی پر گذر رہی ہوتی ہے اور اس طرح وہ اس کی مصیبت کو حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے۔

۲۔ **قرآن پاک کا حکم**:۔ قرآن پاک میں روزوں کی فرضیت کا حکم یوں دیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرۃ)

(اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر روزے فرض تھے، تاکہ تم متقی بنو)

اگلی آیت میں ماہ رمضان کا ذکر کرتے ہوئے روزے رکھنے کا حکم یوں دیا گیا ہے:۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (البقرۃ)

(پس جو کوئی تم میں سے اس مہینہ (رمضان) کو پائے تو وہ اس میں ضرور روزے رکھے)

۳۔ **ارشادات نبویؐ**:۔ روزے کی اہمیت و فضیلت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی متعدد ارشادات کتب احادیث میں مروی ہیں۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ "روزہ (گناہوں سے بچنے کے لیے) ڈھال ہے"۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ "روزہ میرے لیے ہے اور میں خود روزے کی جزا ہوں"۔ ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "جو کوئی فریب کی بات کہنا اور فریب کرنا نہ چھوڑے تو خدا کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے کی حاجت نہیں"۔

**روزے کے مقاصد**

قرآن حکیم میں روزہ کے مندرجہ ذیل تین بنیادی مقاصد بیان ہوئے ہیں:۔

(۱) تقویٰ :- تقویٰ و پرہیزگاری پیدا کرنا جیسا کہ فرمایا: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو)

(۲) شکر :- اللہ کے لیے شکر اور احسان مندی کا جذبہ پیدا ہو جیسا کہ فرمایا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (تاکہ تم شکر گزار بنو)

(۳) ذکر :- ذکر الٰہی اور اللہ کی بڑائی بیان کرنے کا جذبہ۔ جیسا کہ فرمایا وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (تاکہ اللہ نے جو تمہیں ہدایت دی اس پر اسکی بڑائی بیان کرو)

## ضروری احکام

(الف) مندرجہ ذیل باتوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔
(۱) عمداً کھانا پینا (۲) شہوانی خواہش کی تکمیل کرنا (۳) جی بھر کر قے کرنا (۴) حقہ یا سگریٹ پینا (۵) معدے یا گلے میں کچھ پہنچانا۔

(ب) مندرجہ ذیل امور سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔
(۱) تیل عطر یا سرمہ لگانا یا خوشبو سونگھنا یا مسواک کرنا (۲) خود بخود قے ہو جانا یا پیٹ سے ہوا کا خارج ہونا (۳) بھول چوک سے کچھ کھا پی لینا۔

(ج) مسافر اور بیمار کے لیے روزے کی قضا ہے وہ بعد میں گنتی کے روزے رکھے

(د) ایسا ضعیف جس میں روزے کی سکت نہ ہو وہ روزہ نہ رکھے اور کفارے کے طور پر کسی مسکین کو دو وقت کھانا کھلا دے۔

(ھ) اگر کوئی شخص جان بوجھ کر روزہ توڑ دے یا نہ رکھے تو اس پر قضا اور کفارہ دونوں لازم ہیں یعنی وہ ایک غلام آزاد کرے یا مسلسل ساٹھ روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے اور قضا بھی کرے۔

(ی) اگر بلا عذر شرعی ایک روزہ بھی ترک کر دے تو عمر بھر کے روزوں سے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

**ثمرات و فوائد** روزے کے بیشمار انفرادی و اجتماعی فوائد ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔

۱۔ روزے سے اطاعت خداوندی کا جذبہ ابھرتا ہے، ضبط نفس اور روحانی بالیدگی اور قلبی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ اجتماعی حیثیت سے امت مسلمہ میں اتحاد و اتفاق اور مساوات و ہمدردی کے جذبات نشو و نما پاتے ہیں۔

۳۔ رضائے الٰہی حاصل ہوتی ہے اور انسان اللہ کے دنیوی و اخروی انعامات کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

## ۴۔ زکوٰۃ

**مفہوم** زکوٰۃ اسلام کا چوتھا رکن اور نہایت اہم فریضہ ہے۔ زکوٰۃ کا لفظ زکیٰ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پاکیزگی اور بالیدگی کے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں زکوٰۃ سے مراد وہ مالی امداد ہے جو ہر وہ مسلمان جو دولت کی ایک مخصوص مقدار کا مالک ہو محتاج و مستحق لوگوں کے لیے ایک خاص تناسب کے ساتھ اپنے مال میں سے نکالتا ہے۔ چونکہ مستحق لوگوں کے اس حصہ کے نکل جانے کے بعد باقی مال کو طہارت و پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے اسے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں زکوٰۃ کے لیے "صدقہ" کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ لیکن صدقہ کا مفہوم وسیع ہے اور اس کا اطلاق ہر مالی و جسمانی امداد پر ہوتا ہے۔

**زکوٰۃ اور خیرات میں فرق** خیرات ایک نفلی عبادت ہے اور اس کا مفہوم بہت عام اور وسیع ہے۔ محتاجوں اور مفلسوں کی مالی امداد و اعانت کو خیرات کہتے ہیں۔ اسے ہر کوئی ادا کر سکتا

ہے۔ اور اس کی کوئی خاص مقدار مقرر نہیں بلکہ حسب توفیق جسقدر چاہیں دیدیں۔
اگرچہ زکوٰۃ بھی ایک طرح کی خیرات ہے مگر یہ ایک فریضہ ہے جو صرف صاحب استطاعت لوگوں پر عائد ہوتا ہے اور ایک خاص تناسب سے مستحقین کو ادا کی جاتی ہے۔ زکوٰۃ کا اجتماعی طور پر بیت المال کے ذریعہ جمع و تقسیم کرنا زیادہ مستحسن ہے

## زکوٰۃ کے مقاصد

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح نے زکوٰۃ کے دو مقاصد بیان کیے ہیں:۔

۱۔ **ازالہ بخل و امساک**:۔ یعنی کنجوسی و بخیلی اور دولت کے بیجا جمع کیے جانے کو روکنا۔

۲۔ **مفاد عامہ اور بہبودی خلائق**:۔ یعنی عوام الناس سے غربت و افلاس کو دور کر کے ان کی معاشی حالت سدھارنا۔

## زکوٰۃ کی اہمیت

زکوٰۃ کی اہمیت کے مندرجہ ذیل دلائل ہیں:۔

۱۔ **اہم دینی ضرورت**:۔ زکوٰۃ کو اگرچہ ارکان اسلام میں چوتھے نمبر پر رکھا گیا ہے اور وہ اس لیے کہ زکوٰۃ نماز اور روزے کی طرح ہر ایک پر نہیں بلکہ صرف صاحب حیثیت لوگوں پر فرض ہے لیکن زکوٰۃ کے بارے میں قرآن و سنت کی تعلیمات پر نظر ڈالیں تو محسوس ہوتا ہے کہ نماز کے بعد بس اسی کا مقام ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ایمان کے ساتھ جہاں جہاں اعمال صالحہ کا ذکر آیا ہے وہاں صرف دو ہی اعمال یعنی نماز اور زکوٰۃ بیان ہوئے ہیں۔ دراصل اس کا سبب یہ ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کو اسلام میں اتنا اہم مقام حاصل ہے کہ پورے دین پر حاوی ہیں۔
اصولی اعتبار سے احکام دین دو نوع پر منقسم ہیں ایک حقوق اللہ جن کا تعلق اللہ سے ہے اور دوسرے حقوق العباد جن کا تعلق بندوں سے ہے۔

نماز حقوق اللہ کا مغز ہے اور زکوٰۃ حقوق العباد کا نچوڑ ہے۔ نماز اور زکوٰۃ انسان کو خدا پرست بنانے کی سب سے زیادہ موثر تدابیر ہیں ایک ایجابی طور پر اور دوسرے سلبی طور پر۔ نماز خدا کی طرف لے جاتی ہے اور زکوٰۃ دنیا میں لڑھکنے سے بچاتی ہے۔ زکوٰۃ کا بنیادی مقصد تزکیہ نفس و تزکیہ مال ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ دینے والے کا دل حرص سے مبرا ہو جاتا ہے اور اسی کا مال دوسروں کا حق نکلنے کے بعد پاک ہو جاتا ہے۔

۲۔ ہمہ گیر معاشی منصوبہ:۔ دینی نقطہ نظر کے علاوہ زکوٰۃ ایک ہمہ گیر معاشی منصوبہ اور سماجی فلاح کی ایک زبردست سکیم ہے جس سے ملک و ملت کے غریب و نادار افراد کی امداد کی جاتی ہے اور معیشت کو صحتمند بنیادوں پر استوار کیا جاتا ہے۔ جدید علم معیشت میں فلاح کا تصور بہت نیا ہے۔ لیکن اسلام نے آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے فلاحی مملکت کا تصور پیش کرتے ہوئے زکوٰۃ کی شکل میں امداد باہمی کا نظام عطا کیا۔

زکوٰۃ دولت کی غیر مساوی تقسیم اور دولت کی ذخیرہ اندوزی کو رد کرنے اور معاشی توازن پیدا کرنے کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہے۔ زکوٰۃ کا ایک مقصد دین اسلام کی حفاظت و نصرت بھی ہے۔ فی الحقیقت زکوٰۃ ایک عظیم انقلابی معاشی تدبیر ہے۔

۳۔ قرآن و سنت میں تاکید:۔ قرآن و سنت میں نماز کے بعد جس چیز کی سب سے زیادہ تاکید کی گئی ہے وہ زکوٰۃ ہے۔ بلکہ دونوں کو ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا۔ وَمَا | (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دو اور جو تم اپنے لیے آگے |

تُقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا (مزمل)

بھیجو گے اس کو خدا کے پاس بہتر اور ثواب میں زیادہ پاؤ گے)

ایک دوسرے مقام پر زکوٰۃ کا اس طرح حکم دیا گیا ہے کہ:۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبۃ)

(اے نبیؐ! ان کے مال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ اس کے ذریعہ تم ان کو پاک و صاف کر سکو گے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو اپنا نائب بنا کر یمن بھیجا تو توحید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ زکوٰۃ تھی اس کی نسبت فرمایا کہ "وہ ان کے دولتمندوں سے لے کر ان غریبوں میں تقسیم کر دینا"۔ احادیث میں آتا ہے کہ زکوٰۃ کبھی کبھی اسلام کی شرائط بیعت میں بھی شامل کی گئی چنانچہ حضرت جریرؓ بن عبداللہ بجلی کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے تین باتوں پر بیعت کی تھی، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔ وفد عبد القیس نے بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو آپؐ نے اعمال میں پہلے نماز اور پھر زکوٰۃ کو جگہ دی۔

**نصاب و تناسب زکوٰۃ** زکوٰۃ چار چیزوں پر عائد ہوتی ہے۔ (۱) سونا چاندی اور نقدی (۲) جانور مویشی (۳) زمین اور (۴) سامان تجارت۔ بشرطیکہ مقررہ نصاب کے مطابق ہوں اور ان پر ایک سال کی مدت گذر جائے۔

نصاب مال کی وہ کم سے کم مقدار ہے جس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے اور تناسب اس شرح کو کہتے ہیں جس کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرنا ہوتی ہے۔ مختلف

اشیاء کی زکوٰۃ کا نصاب اور تناسب یہ ہے۔ سونے کا نصاب ۷½ تولے اور چاندی کا ۵۲½ تولے، نقدی کا ۲۰۰ درہم اور سامان تجارت اتنی مالیت کا ہو تو ان سب پر زکوٰۃ کی شرح ۲½ % یعنی چالیسواں حصّہ ہے۔ زمین کی فصل جتنی بھی ہو اس پر زکوٰۃ آئے گی۔ نہری یا بارانی زمین پر فصل کا ۱/۱۰ حصّہ اور چاہی یا سیرابی زمین پر فصل کا ۱/۲۰ حصّہ ادا کرنا ہوگی۔ دفینہ جس قدر ملے اس کا ۱/۵ حصّہ زکوٰۃ دینا ہوگا۔ بھیڑ بکری دنبہ کا نصاب ۴۰ ہے اور تناسب ایک۔ گائے بھینس کا نصاب ۳۰ اور تناسب ایک بچھڑا، اونٹ کا نصاب ۵ اور شرح اونٹ کا ایک بچہ ہے۔

## مصارف زکوٰۃ

جن جگہوں پر زکوٰۃ خرچ کی جا سکتی ہے۔ انہیں مصارف زکوٰۃ کہتے ہیں۔ قرآن حکیم میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان ہوتے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) فقراء یعنی محتاج جن کے پاس زندگی بسر کرنے کو کچھ نہ ہو (۲) مساکین جن کے پاس بہت قلیل سامان زندگی ہو اور اگر بر وقت اس کی مدد نہ کی جائے تو بالکل فقیر ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ بے روزگار بھی اس ضمن میں آتے ہیں۔ (۳) عاملین زکوٰۃ یعنی جو زکوٰۃ کی فراہمی پر مقرر ہوں (۴) مؤلفۃ القلوب یعنی نو مسلم جنکے دلوں میں اسلام کی الفت پیدا کرنا مقصود ہے (۵) غلاموں کے آزاد کرنے میں، (۶) قرض داروں کے لیے جو اپنا قرض ادا نہ کر سکتے ہوں (۷) فی سبیل اللہ اللہ کی راہ میں یعنی ان تمام امور پر جو دین و ملت کی حفاظت و استحکام کے لئے ہوں مثلاً ملکی دفاع، اشاعت دین، تعلیمی ادارے، مساجد اور رفاہ عامہ کے کام وغیرہ۔

(۸) مسافر جس کے پاس سفر خرچ نہ ہو۔

اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ زکوٰۃ کی رقم باقاعدہ طریق سے وصول کرے

بیت المال (خزانہ) میں جمع کرے اور ضرورت و حالات کے مطابق جس مصرف پر درکار ہو خرچ کرے۔

**فوائد و ثمرات** زکوٰۃ بے شمار فوائد و ثمرات کی حامل ہے جن میں سے بعض یہ ہیں۔

۱۔ زکوٰۃ ادا کرنے سے انسان میں سخاوت و فیاضی کا جذبہ بڑھتا ہے، بخل و کنجوسی مٹ جاتی ہے اور دوسروں کے لیے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ زکوٰۃ امداد باہمی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس سے ایک دوسرے کی مدد ہو جاتی ہے اور معاشرے میں کوئی بھی شخص ہاتھ پھیلا کر دربدر نہیں پھرتا۔ محتاجوں، یتیموں، بیواؤں اور بے سہارا لوگوں میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔

۳۔ زکوٰۃ سے خدا کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور انسان انعامات ربانی کا حقدار ٹھہرتا ہے۔

## ۵۔ حج

**مفہوم** 'حج' کے لغوی معنی زیارت اور قصد کے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں حج سے مراد مقررہ ایام میں مقررہ رسوم کے ساتھ بیت اللہ (خانہ کعبہ) کی زیارت کا قصد کرنا ہے۔ حج ماہ ذوالحجہ کی ۷ تا ۱۰ تاریخ کو ادا کیا جاتا ہے۔ اگر ان ایام کے علاوہ سال کے اور دنوں میں بعض رسوم کے ساتھ بیت اللہ کی زیارت کی جائے تو اسے "عمرہ" کہتے ہیں۔

**حج کا پس منظر** حضرت آدمؑ جب اس دنیا میں اتارے گئے تو انہوں نے اللہ کی عبادت کے لیے جو سب سے پہلا گھر تعمیر کیا

وہ یہی خانہ کعبہ تھا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ (آلِ عمران)

(بیشک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے تعمیر کیا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے بڑا برکت والا ہے اور سب جہانوں کے لوگوں کا رہنما ہے)

طوفان نوح میں یہ عمارت منہدم ہو گئی اور اس کے نشانات مٹ گئے۔ پھر اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر اسے از سر نو تعمیر کیا۔ جبرائیل امین نے آکر مناسک حج یعنی اس گھر کی زیارت کے آداب بتائے اور اس طرح حج کا آغاز ہوا۔ اس وقت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک بیت اللہ کو مرکزی حیثیت حاصل رہی، دور دراز سے لوگ اس کے حج کے لیے ہر سال آتے تھے۔ مگر دین ابراہیمی میں تحریف کے ساتھ ساتھ حج میں بھی مشرکانہ رسوم شامل ہوتی چلی گئیں۔ خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے جن کا بالعموم برہنہ طواف کیا جاتا تھا اور ان کے نام پر قربانیاں دی جاتی تھیں۔

۸ھ میں مکہ فتح ہوا، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ خدا کو ان بتوں سے پاک کیا تمام بدعات و اختراعات اور مشرکانہ رسوم ختم کر کے حج خالص سنت ابراہیمیؑ کے مطابق رائج کیا۔

## اہمیت و فرضیت

حج اسلام کا پانچواں رکن ہے اور زندگی میں ایک بار ہر اس مسلمان پر فرض ہوتا ہے جو اپنے گھر سے خانہ کعبہ تک سفر کی استطاعت رکھتا ہو۔ قرآن حکیم میں حج کی فرضیت کا اعلان یوں ہوا ہے۔

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا (آلِ عمران)

(لوگوں پر اللہ کا یہ حق عائد کیا گیا ہے کہ جو بھی استطاعت رکھتا ہو اس کے گھر کا حج کرے)

حدیث نبوی میں حج کی اہمیت یوں بیان کی گئی ہے۔ حضور نے فرمایا کہ "جس شخص کو نہ تو کسی خاص ضرورت نے حج کرنے سے روکا، نہ کسی ظالم حاکم نے، نہ کسی مرض نے اور پھر بھی اس نے حج نہ کیا تو اس کی مرضی ہے یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر"۔

حج اگرچہ ایک عبادت ہے لیکن فی الحقیقت یہ تمام عبادات کا مجموعہ اور تمام اعمال خیر کی روح ہے۔ حج نماز بھی ہے کیونکہ اس میں ذکر شامل ہے، زکوٰۃ بھی ہے کیونکہ اس میں اللہ کی خاطر اپنی دولت صرف کی جاتی ہے اور روزہ بھی ہے کیونکہ اس میں جنسی ملاپ اور زیب و زینت کی بھی ممانعت ہے۔

مناسک حج پر نظر ڈالیں تو ہر ایک چیز خدا کی بندگی کا تصور پیش کرتی ہے حج کا لباس احرام، لَبَّیْكَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ کی صدا، طواف کعبہ، صفا و مروہ کی سعی، جمرات پر کنکریاں مارنا، اور منیٰ کی قربانی وغیرہ تمام رسوم خدا کی بندگی، ایثار و قربانی، اخوت و مساوات اور اسلامی بین الاقوامیت اور جہاد کے جذبات اجاگر کرتی ہیں۔

**مناسک حج** مناسک کے معنی رسوم کے ہیں اور مناسک حج سے مراد وہ رسوم و عبادات ہیں جن کی ادائیگی حج کے لیے ضروری ہے یہ مناسک حسب ذیل ہیں:۔

**۱۔ احرام:** یہ وہ لباس ہے جو ہر حاجی حج کے دوران پہنے رکھتا ہے۔ یہ اَن سلی دو چادروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک تہبند کی طرح باندھی جاتی ہے۔

اور دوسری کندھوں پر ڈالی جاتی ہے۔ یہ لباس دراصل اسلامی اخوت و مساوات کی آئینہ داری کرتا ہے۔

**۲۔ تلبیہ:۔** یہ وہ کلمات ذکر ہیں جو حج کے دوران دہراتے رہتے ہیں کلمات یہ ہیں۔

لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ لَبَّیْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ

(حاضر ہوں اے اللہ! میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں سب تعریفیں اور نعمتیں تیرے لیے ہیں اور حکومت بھی تیرے لیے ہے تیرا کوئی شریک نہیں ہے)

**۳۔ طواف:۔** خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانے کا نام طواف ہے۔ ہر حاجی کو سات بار طواف کرنا ہوتا ہے۔

**۴۔ مقام ابراہیم:۔** تعمیر کعبہ کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ نے جس پتھر پہ کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کی دیواریں بلند کی تھیں وہ پتھر حرم کعبہ میں نصب ہے اور اسے مقام ابراہیم کہتے ہیں۔ ہر حاجی یہاں دو رکعت نماز نفل ادا کرتا ہے۔

**۵۔ حجر اسود:۔** وہ سیاہ پتھر ہے جو خانہ کعبہ کے ایک طرف نصب ہے اسے طواف کے چکر شمار کرنے کے لیے لگایا گیا تھا۔ ہر حاجی طواف کے دوران اسے بوسہ دیتا ہے یا ہاتھ سے چھوتا ہے یا صرف اشارہ کرتا ہے۔

**۶۔ سعی:۔** سعی کے معنی دوڑنا ہے اور اس سے مراد حاجیوں کا صفا اور مروہ پہاڑیوں کے درمیان سات بار دوڑنا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی ہاجرہؓ کی یاد میں ہے۔ جو اپنے بچے حضرت اسماعیلؑ کے لیے پانی کی تلاش میں ان پہاڑیوں کے درمیان مضطربانہ دوڑی تھیں۔

۷۔ عرفات :- وہ میدان ہے جو مکہ سے باہر دس میل کے فاصلے پر واقع ہے اور جہاں سب حاجی جمع ہوکر امیر الحج کا خطبہ سنتے ہیں۔

۸۔ رمی :- رمی کنکریاں مارنے کو کہتے ہیں۔ میدان عرفات سے واپسی پر منیٰ کے میدان میں تین ٹیلوں (جمرات) پر سب حاجی یہ کنکریاں مارتے ہیں۔ یہ بھی حضرت ابراہیم کی وہ یاد ہے جب انھوں نے شیطان پر کنکریاں پھینکی تھیں جو انھیں بیٹے کی قربانی سے بہکانے آیا تھا۔

۹۔ قربانی :- منیٰ کے میدان میں تمام حاجی رمی کے بعد جانوروں کی قربانی کرتے ہیں اور سر منڈاتے ہیں۔

## طریق حج

تمام حاجی حدود میقات (وہ مقام جہاں سے حرم مکہ شروع ہوتا ہے) پر پہنچ کر غسل کر کے احرام باندھ لیتے ہیں پھر مکہ میں داخل ہوکر تلبیہ ادا کرتے ہیں اور کعبہ کا طواف کرتے ہیں پھر مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں۔ پھر صفا و مروہ کی سعی کرتے ہیں۔

۷ ذوالحجہ کو مسجد حرام میں امام خطبہ دیتا ہے اور مسائل حج سمجھاتا ہے۔

۸ تاریخ کو عرفات کی طرف روانگی ہوتی ہے۔ رات منیٰ میں گذارتے ہیں اور نماز فجر کے بعد عرفات آتے ہیں ظہر اور عصر کی نمازوں کے بعد ایک پہاڑی جبل رحمت پر دعائیں مانگتے ہیں۔ غروب آفتاب کے بعد مزدلفہ آتے ہیں اور مغرب وعشاء کی نمازیں ادا کر کے رات بسر کرتے ہیں۔ طلوع آفتاب کے وقت یہاں جمرات پر رمی کرتے ہیں۔ ۱۰ تاریخ کو منیٰ پہنچ کر قربانی ادا کرتے ہیں اور احرام کھول دیتے ہیں اور بال ترشواتے ہیں۔ پھر خانہ کعبہ آکر طواف کرتے ہیں، دو تین روز کے لیے دوبارہ منیٰ جاتے ہیں۔ وہاں سے واپس آکر مکہ میں طواف وداع کرتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں۔

**آداب حج** آداب حج سے مراد وہ حدود و شرائط ہیں جن کا دوران حج ملحوظ رکھنا لازمی ہے۔ آداب حج یہ ہیں۔

**۱۔ حرمت شکار:۔** حج کے دوران شکار کرنا ممنوع ہے اور جو کوئی ارادتاً شکار کرے اسے کفارہ ادا کرنا ہوگا جو اسی کے مثل جانور یا اتنی قیمت کے لحاظ سے مساکین کو کھانا کھلانا ہوگا۔

**۲۔ ممانعت جنگ، گناہ اور رغبت عورت:۔** حج کے دوران جنگ، لڑائی جھگڑا، گناہ و فسق اور بیوی سے خلوت کی ممانعت ہے۔ البتہ مدافعت کی خاطر لڑنا جائز ہے۔

**۳۔ اجازت کاروبار:۔** حج کے دوران تجارتی کاروبار کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ حج پر زد نہ پڑے۔

**فوائد و ثمرات** حج بیشمار فوائد و ثمرات کا حامل ہے۔ جن میں سے اہم فوائد حسب ذیل ہیں۔

(۱) اولین فائدہ دینی مقاصد کی تکمیل ہے۔ حج مختلف یادگاروں کا مجموعہ ہے۔ اور حج سے ان یادگاروں کو دیکھ کر دل میں اللہ کی محبت پیدا ہوتی ہے۔

(۲) حج کے دنیاوی فوائد بھی بہت ہیں۔ اس سے عالمگیر اسلامی برادری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ بین الاقوامی تجارت فروغ پاتی ہے۔ سیاحت کے فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ نیز اشاعت دین میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔

باب ۳

# اخلاقِ اسلامی

- تقویٰ
- صدق
- امانت
- صبر
- تحمل
- عفو
- عدل
- احسان
- خدمتِ خلق

# اخلاق

**مفہوم** اخلاق "خلق" کی جمع ہے۔ جس کے معنی طبیعت، عادت اور خصلت کے ہیں۔ اصطلاح میں اخلاق سے مراد وہ عادات و خصائل ہیں جو انسان سے مسلسل سرزد ہوتے رہنے سے اس کی طبیعت کا جزو بن جائیں۔ اگر یہ عادات عمدہ ہوں تو انہیں "اخلاق حسنہ" کہتے ہیں اور اگر یہ عادات بری ہوں تو انہیں "اخلاق سیئہ" کا نام دیا جاتا ہے۔

اسلامی اخلاق سے مراد وہ اخلاق حسنہ ہیں جو اسلام نے بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کے لیے دنیا کو دیئے ہیں۔

## اہمیت

اسلام میں اخلاق کی اہمیت مندرجہ ذیل دلائل سے واضح ہوتی ہے۔

۱۔ **حسن زندگی**:۔ انسان کی اولین حیثیت فرد کی ہے اور افراد ہی کے مجموعے سے معاشرہ بنتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی معاشرے کے تمام افراد اپنی اصلاح کر لیں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھال لیں تو وہ معاشرہ درست و صالح ہو جائے گا اور ایک مثالی اسلامی معاشرہ کہلائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام فرد کی اصلاح کے لیے "اخلاق حسنہ" کے اپنانے پر تاکید کرتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا کا امن و سکون اور ساری خوشحالی کا انحصار اخلاق پر ہی ہے اور اگر اخلاق نہ ہوں تو زندگی کا سکھ اور چین ختم ہو جائے۔ وہی قوم زندگی کے فیوض و برکات کی مستحق ہے جس کے افراد اخلاق حسنہ سے مزین ہوں اور جو قوم اخلاق سے بے بہرہ ہو اس کا تمدنی و معاشرتی شیرازہ منتشر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مفکرین کا خیال ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا سبب بھی اخلاق ہے

چنانچہ خدا تعالیٰ جب کسی قوم کو ملک و سلطنت کے شرف سے نوازنا چاہتا ہے تو پہلے اس کی اخلاقی حالت کی اصلاح فرماتا ہے اور پھر اسے یہ شرف عطا کرتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی قوم بد اطواریوں اور بد اخلاقیوں کی گرویدہ ہو جاتی ہے تو خدا تعالیٰ اسے حکمرانی سے محروم کر کے ان کی جگہ دوسروں کو بر سر اقتدار لاتا ہے۔

مختصر یہ کہ اخلاق حسنہ کے اپنانے سے زندگی میں حسن و نکھار پیدا ہوتا ہے اور تمدنی و معاشرتی ترقی حاصل ہوتی ہے۔

**۲۔ مذاہب کی بنیاد:۔** اخلاق کی اہمیت کا اس بات سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب کی بنیاد اخلاق پر ہی ہے۔ دنیا میں جس قدر پیغمبر اور مصلح ہو گذرے ہیں سب نے اخلاقیات پر زور دیا ہے اور عمدہ اخلاق کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بھی تعلیم اخلاق ہی بتایا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

| | |
|---|---|
| هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ: ۱) | وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو خدا کی آیات سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ |

علماء کرام کے نزدیک اس آیت قرآنی میں "تزکیہ نفس" اور "تعلیم حکمت" سے مراد مکارم اخلاق کی تعلیم و تکمیل ہے۔

خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد یہی بیان کیا فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ | بیشک میں محاسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ |

ایک دوسری حدیث میں فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ حُسْنَ الْأَخْلَاقِ | میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ |

**۳۔ عبادات کا مقصد:۔** اسلام محض عبادات کا نام نہیں بلکہ عبادات اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ درحقیقت عبادات اور اخلاق اسلام کے دو بازو ہیں جن میں کسی ایک کی اہمیت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ نہ تو تنہا عبادات ہی انسان کو صحیح مسلمان بنا سکتی ہے اور نہ ہی تنہا اخلاق۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں عبادت الٰہی کا حکم دیا گیا ہے وہاں ساتھ ہی اخلاق حسنہ کا بھی ذکر کر دیا گیا جیساکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

| | |
|---|---|
| یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (الحج: ۷۷) | اے ایمان والو! ایمان لاؤ، رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور اچھے کام کرو۔ شاید تم کامیاب ہو جاؤ |

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عبادات کا ایک مقصد اخلاق حسنہ کی تعلیم دینا بھی ہے۔ چنانچہ نماز کے متعلق ارشاد خداوندی ہے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۔ | بیشک نماز برائی اور بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے۔ |

روزہ کے متعلق قرآن پاک میں بتایا گیا ہے کہ یہ اس لیے فرض کیا گیا ہے تاکہ لوگوں میں تقویٰ پیدا ہو اور تقویٰ ہی سے خداترسی، صلہ رحمی، محبت و شفقت اور حقوق العباد کی ادائیگی کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ زکوٰۃ کا مقصد بھی دولتمندوں اور غرباء و مساکین کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے انسانی ہمدردی و غمخواری اور اخوت و محبت کے جذبات پیدا کرنا ہے۔ اسی طرح حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح و تربیت کا ذریعہ ہے۔ اور اپنی و دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے۔ اگر عبادات سے یہ روحانی و اخلاقی ثمرات حاصل نہ ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ جوہر و معنی سے یکسر خالی ہیں۔

ایک لحاظ سے تو اخلاق کی اہمیت عبادات سے بھی زیادہ ہے۔ وہ اس طرح

کہ عبادات کا تعلق محض خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے اور اگر کوئی شخص ان کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کو اختیار ہے چاہے تو سزا دے یا معاف کر دے لیکن اخلاق کا تعلق بندوں کے ساتھ ہے۔ اور خدا تعالیٰ بندوں کے حقوق غصب کرنے والے کو معاف نہیں کرتا تا وقتیکہ وہ شخص جس کا حق غصب کیا گیا ہے خود معاف نہ کر دے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس بھائی نے کسی دوسرے بھائی پر ظلم کیا ہو تو اس کو چاہیئے کہ وہ اس دنیا میں اس سے معاف کرا لے ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا صرف اعمال ہوں گے۔ ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی اور اگر نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔ (بخاری)

۴۔ **اسوۂ رسولؐ**:۔ اخلاق کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے لیے بہترین نمونۂ اخلاق بنا کر بھیجا گیا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۱)

البتہ تمہارے لیے رسولؐ خدا ہی میں بہترین نمونہ ہے۔

ایک دوسرے مقام پر آپؐ کے اعلیٰ اخلاق کی یوں گواہی دی گئی ہے۔ فرمایا۔

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ

(اے نبیؐ) بیشک آپ عمدہ و اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔

درحقیقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس قرآن پاک یعنی احکام اسلام کی عملی تصویر ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ سے کسی نے پوچھا کہ آنحضورؐ کا اخلاق کیا ہے؟ آپؓ نے مسائل سے دریافت کیا۔ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ اس نے کہا ہاں پڑھا ہے۔ آپؓ نے کہا وہی حضورؐ کا اخلاق ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کا اندازہ حضرت جعفر طیارؓ کی اس

تقریر سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے نجاشی شاہ حبشہ کے دربار میں کی۔ انھوں نے کہا "اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے۔ بتوں کو پوجتے تھے۔ مردار کھاتے تھے۔ بدکاریاں کرتے تھے۔ ہمسایوں کو ستاتے تھے۔ بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا۔ زبردست زیردستوں کو کھا جاتے تھے۔ اس اثنا میں ایک شخص (حضرت محمدؐ) ہم میں پیدا ہوا۔ اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں۔ سچ بولیں۔ خونریزی سے باز آئیں یتیموں کا مال نہ کھائیں۔ ہمسایوں کو آرام دیں۔ پاکدامن عورتوں پر تہمت نہ لگائیں"۔

اسی طرح ہرقل روم کے دربار میں ابوسفیان جو اسوقت دشمن اسلام تھا نے بھی آپؐ کے اخلاقِ حسنہ کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ آپؐ لوگوں کو خدا کی توحید و عبادت کی تعلیم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ سچ بولیں۔ اور رشتہ داروں کا حق ادا کریں۔

مختصر یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق جمیلہ کی مثالیں بیشمار ہیں۔

۵۔ **ارشاداتِ نبویؐ**:۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں اخلاق کی اہمیت بتائی ہے اور اخلاق کے اپنانے پر زور دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "مسلمانوں میں مکمل ایمان اس شخص کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے"۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ "تم میں سے نیک وہ ہے جو اخلاق میں تم سب سے اچھا ہے"۔ ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں"۔

ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! انسان کو جو چیزیں دی گئی ہیں ان میں سے بہتر کون سی ہے۔ آپؐ نے فرمایا "خوش خلقی"۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے سوال کیا کہ دین کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا "خوش خلقی"۔ ایک شخص نے پوچھا کہ اعمال میں سے افضل کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ "حسن خلق"۔ آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ میزان عمل میں خوش اخلاقی سے بھاری کوئی نیک عمل نہیں ہوگا۔ نیز آپؐ نے فرمایا کہ "خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اخلاق

حسنہ کا اجر آخرت میں بھی بہت زیادہ ہے چنانچہ آپؐ نے فرمایا ہے۔ کہ قیامت کے روز مومن بندے کے ترازو میں حسنِ خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہیں ہوگی۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ قیامت کے روز تم میں سے میرا محبوب ترین اور قریب ترین جلیس وہ ہوگا جو تم میں سے عمدہ اخلاق والا ہوگا اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوگا جو بد خلق ہوگا"۔ ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "میں جنت کی بلندی میں اس شخص کے لیے ایک گھر کا ذمہ لیتا ہوں جو اپنے خلق کو عمدہ بنائے"۔ نیز آپؐ سے پوچھا گیا کہ کونسی چیز جنت میں سب سے زیادہ داخل ہوگی۔ آپؐ نے فرمایا "تقویٰ اور حسنِ اخلاق"۔

آپؐ نے اخلاق کی اہمیت پر اس قدر زور دیا کہ فرمایا "انسان حسنِ اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے"۔

## اسلامی اخلاق کی خصوصیات

اسلام نے اخلاق کا ایک نہایت ہی جامع نظام پیش کیا ہے جس کی بعض امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ **جامعیت**:۔ اخلاق اسلامی کی سب سے اولین خصوصیت یہ ہے کہ یہ نہایت ہی جامع ہیں۔ دنیا کی ہر قوم، ہر ملک، ہر رنگ اور ہر نسل کے لوگ ان سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ نیز حاکم و محکوم۔ آقا و غلام، امیر و غریب ہر طبقہ کے لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اصل بنیاد نیت و کوشش پر ہے۔ اگر ایک کروڑ پتی نام و نمود کی خاطر کروڑوں روپے خرچ کر دیتا ہے تو وہ بے سود ہے اور اس کے برعکس ایک غریب شخص خلوص دل سے روٹی کا ایک ٹکڑا محتاج کو دیتا ہے تو وہ خدا کے ہاں مقبول ہے۔ غرضیکہ اسلامی دستور اخلاق نہایت جامع و ہمہ گیر ہے۔

۲۔ **تفصیلیت**:۔ اسلامی اخلاق کی دوسری خصوصیت ان کا مفصل ہونا ہے اسلامی نظام اخلاق انسان کے سب احوال کو پیشِ نظر رکھتا ہے اور زندگی کے

کسی جزئیہ کو نظر انداز نہیں کرتا۔ دکھ و سکھ، بیماری و تندرستی، دشمنی و دوستی ہر طرح کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اصول و ہدایات دیتا ہے۔ اور زندگی کے ہر ہر جزو کے بارے میں احکام مہیا کرتا ہے۔

۳۔ دائمیت :۔ اسلامی نظام اخلاق محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہی کے لیے نہ تھا بلکہ قیامت تک کے لیے ابدی و دائمی اصول و قوانین دیتا ہے جو ہر دور اور ہر زمانہ کے لیے کافی ہیں۔ اسلامی دستور اخلاق میں فطری لچک موجود ہے جو اسے ہر زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ڈھال دیتی ہے البتہ اس کے بنیادی اصولوں میں قطعاً کوئی لچک و تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

۴۔ عملیت :۔ اسلامی نظام اخلاق کی ایک خصوصیت عملیت یا عمل پذیری ہے۔ یعنی یہ آسانی سے عمل کے ڈھانچے میں ڈھل سکتے ہیں۔ اسلامی اخلاق محض فرشتوں اور دیوتاؤں کے بس کی چیز نہیں بلکہ عام انسان بھی اس پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا عملی نمونہ پیش کیا اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے بھی نہایت کامیاب مثالیں پیش کیں۔

## ۱۔ تقویٰ

**مفہوم** ''تقویٰ'' عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مادہ وقی ہے۔ جس کے معنی ڈرنا، بچنا، حفاظت کرنا اور پرہیز کرنا ہیں۔ اصطلاح شریعت میں ''تقویٰ سے مراد خدا تعالیٰ کے خوف سے اپنی حدود کے اندر رہنا اور ہر قسم کے تجاوز سے بچ کر زندگی بسر کرنا ہے۔

در اصل تقویٰ اس فرض شناسی اور احساس ذمہ داری کا نام ہے جو انسان کے دل میں خوف خدا سے ہر وقت جاگزیں رہتا ہے اور وہ نیکی پر مستعد اور بدی سے مجتنب رہتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ تقویٰ کا مرکز و مسکن دل ہی قرار دیا۔ جیسا کہ فرمایا۔

"اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا" (تقویٰ یہاں ہے)

تقویٰ کا مفہوم اس مثال سے زیادہ واضح ہوجاتا ہے ۔ حضرت عمرؓ نے حضرت کعبؓ الاحبار سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے ؟ انہوں نے کہا کیا آپ کبھی خاردار راستہ پر چلے ہیں ! فرمایا، ہاں ۔ پھر پوچھا کہ آپ کس طرح گذرے ؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنا آپ بچایا اور دامن سمیٹ کر چلا حضرت کعبؓ الاحبار نے کہا ، یہی تقویٰ ہے ۔

اہمیت :- تقویٰ کی اہمیت کے دلائل حسب ذیل ہیں :-

۱۔ تعمیر کردار و تشکیل سیرت :- انسانی کردار کی تعمیر اور اس کی سیرت کی تشکیل میں تقویٰ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔ ہمارے تمام اعمال و افعال کی ابتدا ارادے سے ہوتی ہے اور ارادے کا تعلق دل سے ہے ۔ اس لیے اگر دل میں تقویٰ و پرہیزگاری ہوگی ۔ تو نیت صحیح ہوگی اور انسان جو کام سرانجام دے گا وہ درست و صحیح ہوگا ۔ اگر دل میں تقویٰ نہ ہو تو نیت و ارادہ پر کوئی بندش نہ رہے گی اور انسان خواہشات نفسانی کا تابع ہو کر فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے گا اور کسی کام کا بھی نتیجہ درست نہ ہوگا ۔ اسی بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ۔

"خبردار جسم میں ایک لوتھڑا ہے جب وہ ٹھیک ہو تو سارا جسم درست ہوجاتا ہے اور جب وہ خراب ہو تو سارا جسم خراب ہوجاتا ہے اور جان لو کہ وہ دل ہے ۔"

لہذا تکمیل شخصیت اور تعمیر کردار کے لیے لازمی ہے کہ انسان اپنے دل میں تقویٰ پیدا کرے ۔ اسی لیے خدا تعالیٰ نے بھی قرآن پاک کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ :-

"هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" (یہ متقین کے لیے ہدایت ہے) یعنی قرآن پاک سے استفادہ کرنے کے لیے بھی دل میں تقویٰ ہونا ضروری ہے ۔

۲۔ معیار فضیلت :- اسلام میں شرافت و بزرگی اور فضیلت و برتری کا

معیار مال و دولت یا حسب و نسب یا رنگ و نسل یا قوم و وطن نہیں بلکہ محض تقویٰ ہے۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک وہی شخص شریف و معزز اور اعلیٰ و ارفع ہے جو متقی و پرہیزگار ہو خواہ وہ امیر ہو یا غریب، آقا ہو یا غلام، اور خواہ وہ کسی قوم، خاندان، رنگ، نسل اور وطن سے تعلق رکھتا ہو۔ شرف و فضیلت اسی کو حاصل ہوگا جس میں خدا خوفی و خدا ترسی یعنی تقویٰ موجود ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات) (خدا کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب سے زیادہ معزز کون ہے آپؐ نے فرمایا جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ اس کی مزید تصریح نبی کریمؐ کے اس خطبہ سے ہوتی ہے جو آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا۔ آپؐ کا ارشاد ہے:۔

"کسی عربی کو عجمی پر، کسی عجمی کو عربی پر، کسی سیاہ کو سفید پر، کسی سفید کو سیاہ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔ سب کے سب آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں"

**۳۔ جملہ عبادات کی اصل:۔** اسلام کی جملہ عبادات اور نیکیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کی اصل غرض و غایت فقط تقویٰ ہے۔ چنانچہ خود باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ" (البقرۃ) (اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم متقی بن جاؤ)

اب اگر الگ الگ طور پر تمام عبادات پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً روزے کی فرضیت کا حکم جاری کرتے ہوئے فرمایا "لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ"

تاکہ تم متقی بن جاؤ) حج کے متعلق جہاں یہ حکم دیا کہ سفر پر روانگی سے قبل زادِ راہ لو وہاں یہ بھی بتا دیا کہ "وَخَیْرُ الزَّادِ التَّقْوٰی" (اور بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے) اسی طرح قربانی کے متعلق ارشاد فرمایا کہ "خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔" نماز بھی انسان میں تقویٰ پیدا کرتی ہے جیسا کہ فرمایا :۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔ (بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے)

غرضیکہ اسلام کی تمام عبادات کا مقصود تقویٰ ہی ہے۔

۴۔ اخلاق کی روح :۔ اسلام کے سارے اخلاقی نظام کی بنیاد تقویٰ پر ہے اور کسی انسان کے نیک و بد ہونے کا معیار فقط تقویٰ ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں عدل، عفو، صبر وغیرہ اخلاقِ حسنہ کے اختیار کرنے کا مقصد یہ بتایا کہ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہیں جیسا کہ فرمایا :۔

"اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی" (عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے)

"وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی" (اور معاف کر دینا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے)

لباس ستر ڈھانپنے کے لیے اشد ضروری ہے مگر اس بارے میں بتا دیا گیا کہ "بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔" غرضیکہ تقویٰ اسلامی اخلاق کی روح اور اصل ہے۔

۵۔ تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید :۔ تقویٰ کی اہمیت کے مذکورہ پہلوؤں کے علاوہ سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ خود خدا تعالیٰ نے قرآن پاک میں کئی مقامات پر تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

"وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ" (خدا تعالیٰ سے ڈرو تاکہ تم کامیابی حاصل کرو)

"اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ" (خدا تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے)

اللہ تعالیٰ فقط تقویٰ اختیار کرنے کی ہی تاکید نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ ہی برائی اور شر سے بچنے کا حکم بھی دیتا ہے جیسا کہ فرمایا:

"تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى" (نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کیساتھ تعاون کرو)

**۲۔ ارشادات نبوی ؐ:۔** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی تقویٰ و پرہیزگاری اور خدا خوفی و خدا ترسی کا مرقع تھا۔ آپؐ بچپن ہی سے متقیانہ زندگی بسر کی۔ آپؐ کے خطبوں کا اکثر موضوع تقویٰ ہوتا تھا۔ ہجرت کے بعد قبا کے مقام پر آپؐ نے جو خطبہ دیا اس کا موضوع تقویٰ ہی تھا۔ آپؐ نے فرمایا:۔ لوگو! میں تمہیں تقویٰ کی تلقین کرتا ہوں کیونکہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو جو بہترین ہدایت کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے آخرت کے لیے آمادہ کرے اور تقویٰ کا حکم دے۔ مدینہ شریف میں جمعہ کا جو پہلا ارشاد فرمایا اس کا مرکزی مضمون بھی تقویٰ تھا۔ آپؐ نے فرمایا تقویٰ آبرو دلاتا ہے، خدا کی خوشنودی دلاتا ہے اور درجات بلند کرتا ہے فتح مکہ کے بعد آپ کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو عربی پر نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو گورے پر ماسوئی تقویٰ کے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر بھی لاکھوں انسانوں سے آپؐ نے یہی کلمات ارشاد فرمائے۔

غرضیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا نچوڑ تقویٰ ہی ہے۔

**تقویٰ کے ثمرات و فوائد** تقویٰ کے مندرجہ ذیل فوائد ہیں:۔

**۱۔ رضائے الٰہی:۔** تقویٰ سے اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (بیشک اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے)

**۲۔ دنیوی کامیابی:۔** اللہ تعالیٰ متقیوں کے کاموں میں آسانی پیدا

فرماتا ہے جیسا کہ فرمایا :-

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ اَمْرِہٖ یُسْرًا (اور جو خدا سے ڈرتا ہے خدا اس کے لیے اس کا کام سہل کر دیتا ہے)

۳۔ آخرت میں کامرانی :- اہل تقویٰ کو دنیا میں بہت ایثار کرنا پڑتا ہے لہٰذا انہیں آخرت میں دائمی اجر ملتا ہے۔ فرمایا :-

(۱) وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ (اور عاقبت متقیوں کے لیے رہے)

(۲) اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ (بیشک متقی باغوں اور چشموں میں ہونگے)

## ۲۷۔ صدق

**مفہوم** | صدق کے لغوی معنی سچائی اور راست گوئی کے ہیں اور جو شخص ہمیشہ سچ بولتا ہے اسے "صدیق" کہا جاتا ہے۔ صدق کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کا دل اور زبان ایک دوسرے کے مطابق ہوں۔

**اہمیت** | صدق کی اہمیت مندرجہ ذیل دلائل سے واضح ہوتی ہے :-

۱۔ زندگی کا جوہر :- صدق انسانی زندگی کا بہت اہم جوہر ہے۔ سچ بولنے کی عادت انسان کو بہت سی برائیوں سے بچاتی ہے کیونکہ سچ بولنے والا ہر برائی سے بچنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ وہ ہمیشہ سچ بولے گا۔ ایماندار ہوگا، وعدہ ایفا کرے گا۔ دل کا پاک و صاف ہوگا۔ ریاکار، منافق اور خوشامدی قطعاً نہیں ہوگا۔ سب اس پر اعتماد کریں گے اور اس کی طرف متوجہ ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ صدق بہت سی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد ہے۔

۲۔ صفت باری تعالیٰ :- صدق اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے بھی ایک اہم صفت ہے۔ قرآن حکیم میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے :-

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا (النساء) (اور اللہ سے زیادہ قول میں سچا کون ہے)

ایک دوسری جگہ فرمایا:۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا (اور کون اللہ سے زیادہ بات میں سچا۔)

۳۔ رسولوں کی صفت:۔ صدق اللہ تعالیٰ کے سب نبیوں کی بھی صفت رہی ہے کیونکہ اگر انبیاء میں یہ صفت نہ ہو تو ان کی نبوت بے معنی ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے۔

اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا (بیشک وہ بڑے سچے اور نبی تھے)

حضرت یوسف علیہ السلام کو یوں مخاطب فرمایا:۔

یُوْسُفُ اَیُّہَا الصِّدِّیْقُ (یوسف! اے بڑے سچے)

۴۔ اسوۂ نبویؐ:۔ آنحضرتؐ نے خود دنیا کے سامنے مجسم صدق بن کر صداقت کا نمونہ پیش کیا۔ ابوجہل جیسے دشمن اسلام نے بھی آپ کی صداقت کا اعتراف کیا اور کہا "محمدؐ کو جھوٹا نہیں کہتا مگر ان کا پیغام قبول کرنے کو جی نہیں چاہتا" ابوسفیان نے بھی قیصر روم کے سامنے آپ کی صداقت کی شہادت دی۔ نبوت سے قبل ہی لوگ آپؐ کو "صدیق" کہہ کر پکارتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اس میں چار عیب ہیں۔ شراب پیتا ہے، چوری کرتا ہے، بدکاری کا عادی ہے اور جھوٹ بولتا ہے۔ وہ آپؐ سے کہنے لگا ان میں سے کوئی ایک ترک کر سکتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جھوٹ نہ بولا کر۔ اس نے اس پر عمل کیا اور جب باقی عیب باری باری کرنے لگا تو اسے خیال آیا کہ حضورؐ نے پوچھ لیا تو کیا جواب دوں گا اگر سچ بولا تو سزا ملے گی اور جھوٹ بولا تو وعدہ خلافی ہو گی۔ اس طرح اس نے چاروں عیب چھوڑ دیئے۔

۵۔ مومنوں کو حکم:۔ اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو صدق کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۔ (اے ایمان والو! اللہ سے تقویٰ اختیار کرو اور سچ بولنے والوں کے ساتھ رہو)

صدق کی اقسام | صدق یا سچائی کی مندرجہ ذیل تین اقسام ہیں :۔

۱۔ زبان کی سچائی :۔ زبان کی سچائی یہ ہے کہ زبان سے ہمیشہ ٹھیک اور درست بات ہی نکلے اور حقیقت کے خلاف کچھ نہ کہے۔ یہ اسلام اور ایمان کی نشانی ہے اور اس کے خلاف کہنا جھوٹ اور نفاق کی علامت ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ مومن ہر خصلت پر پیدا ہو سکتا ہے مگر بے ایمانی اور جھوٹ پر نہیں۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ وہ شخص کامل مومن نہیں جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح نہ چھوڑ دے یہاں تک کہ مذاق اور جھگڑے میں بھی۔

ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ سچ بولنا انسان کو نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں "صدیق" لکھ لیا جاتا ہے اور جھوٹ بدی کی طرف لے جاتا ہے اور بدی دوزخ کی طرف لے جاتی ہے۔ آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں کذاب لکھ لیا جاتا ہے۔

۲۔ دل کی سچائی :۔ دل کی سچائی یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے خلوص دل سے کہا جائے۔ زبان سے ساتھ حضورؐ کا اقرار تو منافق بھی کرتے تھے مگر دل سے تصدیق نہیں کرتے تھے اسی لیے قرآن پاک نے ان کے بارے میں کہا۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (بلاشبہ یہ منافق جھوٹے ہیں)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کے روز تین شخص اللہ کے حضور میں پیش ہوں گے ایک عالم دوسرا دولتمند اور تیسرا شہید۔ ہر ایک اپنے کارنامے بیان کرے گا مگر اللہ تعالیٰ

فرمائے گا کہ تم سب جھوٹے ہو کیونکہ ان کے سب اعمال دنیاوی شہرت و ناموری کیلئے تھے ان میں دل کی سچائی شامل نہ تھی۔

**۳۔ عمل کی سچائی:۔** عمل کی سچائی یہ ہے کہ انسان کا ہر فعل اور عمل اس کے ضمیر کے مطابق ہو یعنی ظاہر اور باطن ایک ہو۔ قرآن حکیم میں ایسے ہی لوگوں کو مومن کہا گیا ہے فرمایا:۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ

(الحجرات: ۱۵)

(مومن صرف وہی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسول ؐ پر ایمان لائے۔ پھر انہوں نے شک نہ کیا اور انہوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہی سچے ہیں)

**ثمرات و فوائد** صدق کے بیشمار فائدے ہیں۔ سچ بولنے والا انسان صاف اور کھرا ہوتا ہے اور ہر ایک اس پر اعتماد و بھروسہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اس سے خوش ہوتا ہے اور اخروی انعامات سے نوازتا ہے۔

# ۳۔ امانت

**مفہوم** امانت کا لفظ امن سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی اعتبار کے ہیں۔ اصطلاح میں امانت سے مراد کوئی شے حفاظت کے لیے یا ضمانتاً کسی کو سپرد کرنا ہے اور جس کے سپرد کی جائے اسے ''امین'' کہتے ہیں۔

**اہمیت** امانت کی اہمیت درج ذیل ہے۔

**۱۔ معاشرے کی بقا:۔** امانت ایک ایسا اخلاقی وصف ہے جس کا اپنانا ہر فرد کے لیے ضروری ہے اور کسی معاشرے کی سالمیت اور استحکام کا سارا دارومدار اسی پر ہوتا ہے۔ معاشرے میں ایک دوسرے سے لین دین اور کاروبار ناگزیر امر ہے اور اکثر کاروبار اعتبار اور بھروسے پر ہوتا ہے۔ اس لیے اگر افراد معاشرہ اس وصف سے خالی ہوں تو اس معاشرے کی بقا ممکن نہیں۔ احادیث میں قیامت کی جس قدر نشانیاں بیان کی گئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا سے امانت داری اٹھ جائے گی یعنی "امانت" نہ ہونے کی وجہ سے دنیا تباہ ہو جائے گی۔

**۲۔ ارشاد ربانی:۔** قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر امانت داری اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا (النساء:۵۹) | (بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچا دیا کرو) |

ایک دوسرے مقام پر اسے مومنوں کی صفت قرار دیا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ (المومنون:۸) | (مومن اپنی امانتوں کا اور اپنے وعدوں کا خیال رکھتے ہیں۔ |

ایک جگہ خیانت کرنے والوں کی مذمت میں فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ (الانفال: ۵۸) | (بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کو بالکل پسند نہیں کرتا) |

**۳۔ اسوہ رسول ﷺ:۔** "امانت" آنحضرت ﷺ کا امتیازی وصف تھا اور آپ ﷺ کے دشمن آپ ﷺ کو "الامین" کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور اپنی قیمتی امانتیں آپ ﷺ ہی کے پاس رکھتے تھے۔ چنانچہ ہجرت کے وقت آپ ﷺ کے پاس کفار کی بہت سی امانتیں موجود تھیں جنہیں واپس کرنے کا فریضہ حضرت علیؓ کو سونپا گیا۔

آنحضرتؐ کے پاس سب سے بڑی امانت پیغام ربانی تھی۔ انتہائی مشکلات و مصائب کے باوجود آپؐ نے یہ امانت لوگوں تک پہنچادی۔ چنانچہ آخری حج کے موقع پر صحابۂ کرام نے اس کا اعتراف کیا۔

امانت کے بارے میں آنحضرتؐ کے متعدد ارشادات بھی کتب احادیث میں مروی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:۔

لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ (جس شخص میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں)

ایک دوسری حدیث میں فرمایا "مومن وہ ہے جس کی امانت میں لوگ اپنی زندگیاں اور اپنے اموال سونپ دیں۔

**ثمرات و فوائد** امانتداری سے دنیاوی کاروبار خوش اسلوبی سے طے پاتا ہے۔ معاشرہ کے ہر فرد کو سکون ملتا ہے۔ اور معاشرے کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ خدا کی رضا اور اخروی انعامات بھی میسر آتے ہیں۔

## ۴۔ صبر

**مفہوم** صبر کے لغوی معنی رکنا، سہارنا اور باندھنا ہیں۔ لیکن اصطلاح شریعت میں صبر سے مراد مصیبت، سختی اور ایذاء کے وقت استقلال واستقامت اور جرأت و بہادری کا ثبوت دینا اور اپنے نفس کو اضطراب و گھبراہٹ سے روکنا ہے۔ چنانچہ امام راغبؒ کے نزدیک صبر کا مفہوم یہ ہے کہ عقل و شرع کے مطابق انسان اپنے نفس کو ان امور سے باز رکھے جن سے روکنے کا شریعت تقاضا کرتی ہے۔ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر صبر کا لفظ مختلف مطالب کے اظہار کیلئے استعمال ہوا ہے لیکن سب جگہ بنیادی مفہوم ایک ہی ہے یعنی استقلال و

استقامت اور ثابت قدمی و پامردی۔

**اہمیت** | صبر کی اہمیت مندرجہ ذیل دلائل سے واضح ہوتی ہے۔

**۱۔ انسان کی تخلیق کا مقصد**:۔ زندگی رنج و راحت اور غم و مسرت کا مجموعہ ہے۔ انسان پر حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ کبھی تنگی ہے تو کبھی فراخی۔ کبھی بیماری ہے تو کبھی صحت۔ حالات کی اس گردش کا مقصد انسان کے صبر کا امتحان لینا ہے۔ تاکہ دیکھا جائے کہ کون تنگی، غربت، بیماری وغیرہ برے وقتوں میں خدا تعالیٰ کو یاد کرتا ہے۔ اور اس کے احکام کو بجا لاتا ہے۔ اور کون اس سے روگردانی اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق ہی آزمائش کے لیے ہوئی جیسا کہ فرمایا:

لَتُبْلَوُنَّ فِیْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (النساء) (جانوں اور مالوں میں تمہاری آزمائش ہوگی)

**۲۔ قرآن پاک میں تاکید**:۔ صبر ان فضائل اخلاق میں سے ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ تعریف کی ہے اور قرآن پاک میں متعدد مقامات پر جن کی تلقین کی گئی ہے۔ صبر کا ذکر ستر سے زائد مقامات پر ہوا ہے اور مختلف انداز میں اس کی تعریف و توصیف کی گئی ہے خدا تعالیٰ نے اپنے انعامات و اکرامات کو صبر کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور صبر کرنے والوں کو بلند مدارج و اعلیٰ مراتب کی خوشخبری دی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (یوسف: ۹۰)

(بے شک جو کوئی تقویٰ اختیار کرے اور صبر سے کام لے تو اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرے گا)

علاوہ ازیں دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے صبر کی تاکید فرمائی جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

۱

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (اور صبر اور نماز سے استعانت حاصل کرو)

إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۲:   )     بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے

**۳۔ اسوۂ انبیاؑء:۔** جملہ انبیائے کرامؑ صبر کی صفت سے متصف تھے۔ ان پر بڑی ہی سخت آزمائشیں آئیں لیکن ان کی زبانوں سے کبھی بھی شکایت کا لفظ نہ نکلا بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے تمام مشکلات و مصائب کو برداشت کیا اور صبر ہی کی بدولت اپنے مقاصد و عزائم میں کامیاب ہوئے۔ درحاصل جتنا بھی کوئی عظیم پیغمبر ہوا اسے اتنے ہی صبر آزما مراحل سے گذرنا پڑا۔

حضرت ایوب علیہ السلام اپنے مال و دولت، جاہ و حشمت اور اولاد سے محروم کر دیئے گئے حتیٰ کہ صحت جیسی نعمت بھی ان سے چھن گئی مگر زبان پر شکوہ تک نہ آیا بلکہ یہی کہا "اے پروردگار! مجھے نقصان ضرور پہنچا ہے اور تو ہی سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے" چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود ایوب علیہ السلام کی مدح بیان فرمائی:۔

إِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا (ص: ۴۴)     بیشک ہم نے (ایوبؑ) کو صابر پایا۔

حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا۔ وطن اور خاندان کو خیرباد کہنا پڑا حتیٰ کہ بیٹے کی قربانی طلب کی گئی لیکن قطعاً گھبراہٹ اور جزع و فزع کا اظہار نہیں کیا۔

حضرت یعقوبؑ کو جب خبر دی گئی کہ ان کے چہیتے بیٹے یوسفؑ کو بھیڑیئے نے کھا لیا ہے تو آپ "صبر جمیل" کا اظہار کیا جس کی شہادت خود قرآن پاک نے دی ہے

خود ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ہر پہلو صبر سے لبریز ہے۔ آپؐ نے یتیمی میں پرورش پائی۔ چالیس برس کی عمر میں منصب نبوت پر سرفراز ہوئے تو مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سوائے چند اصحاب کے جنہوں نے آپؐ کی آواز پر لبیک کہا سب دشمن ہو گئے۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، سر پر مٹی ڈالی گئی۔ طائف تشریف لے گئے تو پتھروں سے لہولہان کر دیا گیا۔ لیکن آپؐ نے

صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور کسی کے لیے بد دعا تک نہ کی۔ آپؐ کے خاندان والوں نے آپؐ سے معاشرتی مقاطعہ کیا اور شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور رہنا پڑا مگر زبان پر حرفِ شکایت نہ آیا۔ یہیں تک نہیں بلکہ آپؐ کو (معاذ اللہ) قتل کرنے کی سازشیں کی گئیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود آپؐ کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئی۔ اور آپؐ انتہائی صبر و استقامت اور استقلال و پامردی سے مصروفِ عمل رہے۔ بالآخر اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپؐ کو شاندار کامیابی عطا کی۔

**صبر کے ثمرات و فوائد** صبر کے بیشمار فوائد ہیں جن میں سے چند اہم یہ ہیں۔

**۱۔ مصائب کے لیے قوت برداشت:۔** صبر سے انسان مشکلات و مصائب کا عادی ہو جاتا ہے تکلیف کا احساس نہیں رہتا اور انسان نامساعد حالات کا دل جمعی سے مقابلہ کر سکتا ہے۔

**۲۔ گناہوں کا کفارہ:۔** صبر انسان کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ اور صبر اختیار کرنے سے انسان کے پچھلے گناہ ختم کر دیئے جاتے ہیں اور اسی کی خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن پر جب بھی سختی یا بیماری یا پریشانی یا رنج یا تکلیف یا غم آئے یہاں تک کہ اسے کانٹا بھی چبھے تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کی کچھ خطائیں معاف کر دیتا ہے (بخاری و مسلم)

**۳۔ خدا تعالیٰ کی معیت و محبت:۔** صبر کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ صبر کرنے والا خدا تعالیٰ کے ہاں بڑی قدر و منزلت حاصل کر لیتا ہے۔ خدا تعالیٰ اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اسے باری تعالیٰ کی معیت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

**۴۔ اجر بے حساب:۔** اجر کے اعتبار سے کوئی بھی اخلاقی فضیلت

صبر کے ہم پلہ نہیں ۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کا اجر مطلقاً ضائع نہیں کرتا بلکہ
بے حد و حساب عطا کرتا ہے ۔ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے ۔
إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ (صبر کرنے والوں کو ان اجر بے حساب دیا جائے گا)

## ۵ - تحمل

**مفہوم** تحمل کا لفظ "حمل" سے ماخوذ ہے جس کے معنی "اٹھانا" ہیں
تحمل کے لغوی معنی اٹھانا ، برداشت کرنا ، حلم و بردباری کا
مظاہرہ کرنا ہے ۔ اصطلاح شریعت میں تحمل کا مفہوم یہ ہے کہ مخالفت ، تکلیف
اور ناگوار بات کو صبر و حوصلہ سے بخوشی برداشت کرنا اور قدرت کے باوجود انتقام
نہ لینا ہے ۔ غصہ سے مغلوب ہو کر یا جذبات سے مشتعل ہو کر جلد بازی نہ لینا اور
زیادتی کرنے والے شخص کو نہایت فراخدلی اور عالی حوصلگی سے معاف کر دینا
اور اس سے نرمی و بردباری اور تواضع و خندہ پیشانی سے پیش آنا ہے ۔ در
اصل تحمل اور حلم دونوں ہم معنی اور ایک دوسرے کے مترادف ہیں ۔

**تحمل کی اہمیت** اسلام میں تحمل کی اہمیت کے مندرجہ ذیل پہلو ہیں :-

**۱ - معاشرہ میں قیام امن کا باعث :-** انسان کو اپنی روزمرہ زندگی میں
سینکڑوں افراد سے واسطہ پڑتا ہے ۔ بعض لوگ تو ایسے ملتے ہیں جو اس کی طبیعت
اور مزاج کے مطابق ہوتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا مزاج اس
سے بہت مختلف ہوتا ہے ۔ وہ اس کی طبیعت کے خلاف باتیں کر دیتے ہیں جو اس
کے لیے ناگوار ہوتی ہیں ۔ اس اختلاف طبیعت سے بگاڑ اور انتشار پیدا ہوتے

کا اندیشہ ہوتا ہے۔

ایسے حالات میں جو چیز اس انتشار کو روک سکتی ہے اور معاشرہ میں امن و سکون برقرار رکھ سکتی ہے وہ صفت تحمل ہے۔ اگر انسان میں یہ صفت موجود ہو تو وہ اپنے مخالفین کو برداشت کر سکتا ہے ان کی باتیں سن کر ان کا مدلّل جواب دے سکتا ہے اور جہاں دوسرا فریق بات سننے پر آمادہ نہ ہو اس کی ناگوار باتیں سن کر نظر انداز کر سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تحمل انسان کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں برداشت و بردباری کا سبق دیتا ہے۔ اور اگر افراد معاشرہ میں یہ حقیقت موجود نہ ہو تو ایسے معاشرہ میں کبھی امن و سکون پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ ہر وقت بگاڑ اور خرابی پیدا ہوتی رہے۔ اسی طرح انفرادی زندگی میں بھی صرف وہی شخص کامیابی و کامرانی حاصل کر سکتا ہے جس میں تحمل کی صفت موجود ہو کیونکہ وہ اس صفت کی بدولت ہر ناگوار اور گراں بات کو برداشت کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ لہٰذا ایک خوشگوار معاشرتی زندگی کے قیام کے لیے تحمل ایک لازمی عنصر ہے۔

**۲۔ صفتِ الٰہی:۔** تحمل اللہ تعالیٰ کی بیشمار صفات میں سے ایک ہے اور اس کے صفاتی ناموں میں ایک نام حلیم بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ حلیم ہے اور اپنے بندوں پر بردباری کرتا ہے اور یہی صفت اپنے بندوں میں دیکھنا چاہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر حلیم نہ ہو اور ہر بات پر پکڑ کرنے لگے تو کوئی بھی شخص اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی کماحقہٗ پابندی کرنا اور کلی طور پر اس کی منشاء و رضا کے مطابق زندگی بسر کرنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ انسان سے روزانہ سینکڑوں خطائیں اور گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں جن کا اسے خود بھی علم نہیں ہوتا۔ مگر خدا تعالیٰ

اپنی صفت "حلیم" کی بنا پر بندوں سے درگذر کرتا رہتا ہے۔ اور انہیں اصلاح کا موقع دیتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا متعدد بار اعلان ہوا ہے۔ فرمایا:۔

وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ
اللہ تعالیٰ بےنیاز تحمل والا ہے (البقرہ ۲۶۳)

وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَلِیْمٌ
اللہ جاننے والا تحمل والا ہے (النساء: ۳)

ان آیات میں اللہ کی صفت حلیمی کے ساتھ دوسری صفات ربانی خصوصاً صفت مغفرت کا بھی ذکر ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا حلم (معاذ اللہ) کسی مجبوری یا لاچاری کے باعث نہیں بلکہ اس کی شان غفاری کا نتیجہ ہے۔

۲۔ صفت انبیاء:۔ تمام انبیاء جو بنی نوع انسان کی ہدایت و رہبری کے لیے وقتاً فوقتاً اس دنیا میں آتے رہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی صفت تحمل سے مزین کیا۔ قرآن پاک میں متعدد انبیاء کی اس صفت کا ذکر ہوا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ جنھوں نے راہ حق میں بیشمار مصیبتیں برداشت کیں نمرود نے آپ کو دہکتی آگ میں ڈالا، جلاوطن کئے گئے۔ اپنی بیوی اور بیٹے کو بے آب وگیاہ ریگستان میں چھوڑا۔ پھر اپنے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ آپ نے ساری آزمائشیں نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیں اور تحمل و بردباری کا اظہار کیا چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہوا۔

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ (بیشک ابراہیم بڑے نرم دل اور تحمل والے تھے) (التوبۃ: ۱۱۴)

حضرت اسماعیل جو راہ خدا میں قربان ہونے کے لیے تیار ہوگئے تھے۔ قرآن حکیم ان کے بارے میں کہتا ہے۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ (والصّٰفّٰت: ۱۰۱) (ہم نے ابراہیمؑ کو ایک حلیم بیٹے (اسماعیلؑ) کی خوشخبری دی)۔

حضرت موسیٰؑ کو بھی فرعون کے مقابلہ پر بڑی آزمائشوں اور تکلیفوں سے گزرنا پڑا۔ آپ کی قوم بھی آپ کو بہت ستاتی رہی مگر آپ نے ہمیشہ تحمل و بردباری کا ثبوت دیا۔
حضرت عیسیٰؑ کو یہود کے ہاتھوں بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں حتیٰ کہ آپ کو سولی پر چڑھایا گیا۔ مگر آپ نے ہر موقع پر تحمل و بردباری کا اظہار کیا۔

۴۔ اسوۂ رسولؐ :۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر آئے اس لیے آپؐ مجسمۂ تحمل تھے۔ آپؐ کی حیات طیبہ ایسے واقعات سے بھرپور ہے کہ آپؐ نے کبھی کسی سے انتقام نہ لیا بلکہ اپنے جانی دشمنوں تک کو معاف کر دیا۔
بعثت کے بعد جب آپؐ نے تبلیغ اسلام کا آغاز کیا تو کفار و مشرکین مکہ نے آپ کی سخت مخالفت کی۔ آپؐ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ راستے میں کانٹے بچھائے اور آپؐ پر کوڑا کرکٹ پھینکا۔ آپؐ کو شہید کرنے کے منصوبے بنائے شعب ابی طالب میں تین سال تک محصور رہے۔ مگر آپ نہایت تحمل سے برداشت کرتے رہے۔ فتح مکہ کے موقع پر جب ان پر غلبہ حاصل ہوا تو عفو عام کا اعلان کیا۔ طائف کی طرف گئے تو وہاں کے غنڈوں نے پتھر برسا کر آپؐ کو لہو لہان کیا۔ مگر آپؐ نے ان کے لیے بددعا تک نہ کی بلکہ عدیم المثال تحمل کا مظاہرہ کیا۔

ہجرت کے بعد مدینہ پہنچے تو یہود نے آپؐ کے خلاف سازشوں کا جال بچھا دیا۔ دوسری طرف منافقین طرح طرح سے زیادتیاں کرتے رہے۔ مگر حضورؐ نہایت تحمل سے سب کچھ برداشت کرتے رہے اور یہود پر غلبہ حاصل کرنے کے باوجود انتقام نہ لیا۔ غزوات کے موقعوں پر بھی آپؐ ہمیشہ عورتوں بچوں بوڑھوں، بیماروں اور معذوروں سے انتہائی تحمل سے پیش آتے تھے۔

قبیلوں سے بھی آپؐ حلم و بردباری کا سلوک کرتے تھے۔

انفرادی زندگی میں آپؐ کے تحمل کی مثالیں لاتعداد ہیں۔ عبداللہ بن ابی جو منافقین کا سردار تھا اور آپؐ کے خلاف ہمیشہ سازشیں کرتا رہا آپؐ نے اس سے ہمیشہ تحمل و درگزر سے کام لیا، وحشی جس نے غزوہ احد میں آپ کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا اور ابو سفیان کی بیوی ہندہ جس نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبایا تھا آپؐ نے غلبہ حاصل کرنے پر ان سے تحمل و درگزر کا سلوک کیا۔

**۵۔ ارشاداتِ نبویؐ:۔** حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحمل کی عملی مثال پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی اس کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ آپؐ کے چند ارشادات درج ذیل ہیں۔

(i) فرمایا جو شخص چاہتا ہے کہ قیامت کے روز اس کے درجات بلند ہوں تو جو اس سے ظلم کرتا ہے اس کو معاف کر دے، جو اس سے بخل کرتا ہے اس سے سخاوت کرے، جو اس سے تعلق توڑتا ہے اس سے تعلق جوڑے اور جو اس سے ضد کرتا ہے اس سے حلم و بردباری کا سلوک کرے۔

(ii) قبیلہ عبدالقیس کے سردار سے فرمایا کہ تجھ میں دو خصلتیں ہیں جنہیں خدا اور اس کا رسولؐ محبوب رکھتے ہیں۔ ایک حلم یعنی بردباری اور دوسرے رفق یعنی آہستگی۔

(iii) ایک مرتبہ صحابہؓ سے فرمایا کہ اللہ کے ہاں بلندی تلاش کرو، صحابہؓ نے عرض کیا وہ بلندی کیا ہے؟ فرمایا جو تم سے رشتہ قطع کرے تو تم اس سے جوڑو، جو محروم رکھے تو تم اسے دو اور جو نادانی کا رویہ اختیار کرے تو تم اس سے تحمل سے پیش آؤ۔

(iv) ایک شخص کی نصیحت کی بار بار درخواست پر آپؐ نے ہر مرتبہ فرمایا کہ غصہ

نہ کر اور اگر غصہ آ بھی جائے تو اسے برداشت کر۔

...نے فرمایا جو شخص قدرت کے باوجود غصہ کو برداشت کرے گا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے روز سامنے بلا کر اعلیٰ درجہ کا انعام عطا فرمائے گا۔

**ثمرات و فوائد** | تحمل کے مندرجہ ذیل فوائد و ثمرات ہیں:۔

**۱۔ معاشرتی زندگی میں سکون:۔** تحمل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان کی گھریلو اور معاشرتی زندگی پرسکون اور خوشگوار بن جاتی ہے۔ معاشرہ مستحکم بنیادوں پر استوار ہوتا ہے اور افراد معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ دشمن دوست بن جاتے ہیں اور ایک خوشگوار معاشرہ جنم لیتا ہے۔

**۲۔ دنیوی کامیابی:۔** تحمل سے انسان مشکلات و مصائب کا خوگر ہو جاتا ہے اور وہ ناگوار و ناسازگار حالات سے گزر کر ترقی و کامیابی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ انسان میں عالی حوصلگی، بلند ہمتی اور حلیمی و برداشت جیسی اعلیٰ صفات پیدا ہوتی ہیں۔ اور زندگی کی کامرانیاں اس کے قدم چومنے لگتی ہیں۔

**۳۔ اخروی کامیابی:۔** تحمل سے خدا اور رسولؐ کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہے جو ایک مسلمان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس طرح متحمل انسان خدا کی رضا حاصل کر کے اخروی انعامات اور جنت کا حقدار بن جاتا ہے۔

## ۶۔ عفو

**مفہوم** | عفو کے معنی معاف کرنا، درگزر کرنا، نظر انداز کرنا اور انتقام نہ لینا ہے۔ قرآن مجید میں اسے مغفرت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کا بندے کے گناہ کی پردہ پوشی کرنا اور بخش دینا عفو کہلاتا ہے۔ شریعت کی اصطلاح

عفو سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کی لغزش، زیادتی اور برائی کے بدلہ میں قدرت
بدلہ رکھنے کے باوجود انتقام نہ لینا اور درگزر کرتے ہوئے معاف کر دینا ہے۔

**عفو کی اہمیت:-** عفو کی اہمیت کے مندرجہ ذیل دلائل ہیں:

**۱۔ معاشرہ کا امن و استحکام:-** عفو معاشرے کے امن و استحکام کا ضامن ہے
باہمی تعاون و اشتراک اور الفت و محبت کے جذبات ہی معاشرہ کی بنیاد
اور جان ہوتے ہیں۔ لیکن انسان خطا کا پتلا ہوتا ہے ہر انسان سے غلطیاں سرزد ہوتی
ہیں اور کون ہے جو خطا و بھول سے مبرا ہے؟ اس لیے اگر ایک انسان دوسرے انسان
کی خطاؤں اور لغزشوں سے چشم پوشی نہ کرے اور ہر چھوٹی بڑی غلطی پر انتقام لینے
کے درپے ہو تو انتقام در انتقام کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے اور تمام
دنیا کا امن و سکون ختم ہو کر فتنہ و فساد پھیل جائے۔ اسلام کے معنی امن کا نظام
ہے۔ امن پسند دین اسلام نے اپنے پیروکاروں سے تقاضا کیا ہے کہ وہ باہم عفو اور
بردباری سے کام لیں۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ "ایک دوسرے کو
معاف کر دیا تمہارے باہمی کینے دور ہو جائیں گے۔"

**۲۔ عفو صفت الٰہی ہے:-** عفو خدا تعالیٰ کی خصوصی اور امتیازی صفت
ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسکے اختیار کرنے کی بار بار تاکید فرمائی ہے اللہ تعالیٰ کے
اسماء الحسنیٰ غافر (بخشنے والا) غفور (بخشنے والا) اور عفو (معاف کرنے والا) کا قرآن حکیم
میں ستر سے زائد مقامات میں ذکر ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ بار بار مختلف انداز میں
اپنی عفو و بخشش کا اعلان کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

(۱) اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا — بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا
(النساء: ۴۳) — اور بخشنے والا ہے۔

ہو۔ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی برائیوں سے صرف نظر کرتا ہے اور ان کی توبہ قبول کرتا ہے

هُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوا عَنِ السَّيِّئَاتِ (شوریٰ) — اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کرتا ہے

**۳۔ اسوۂ رسولؐ :** حضور نبی کریمؐ عفو و کرم کا مجسمہ تھے اور آپؐ کی ذات عفو و بردباری کا اعلیٰ نمونہ تھی اللہ تعالیٰ نے خود اپنے حبیب کریمؐ کو اس امر کی تلقین کی، فرمایا :

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (اعراف - ۲۰۰) — (اے نبیؐ) آپ عفو کو اپنائیے، اور نیکی کا حکم دیجئے نیز جاہلوں سے کنارہ کشی اختیار کیجئے

ایک دوسری جگہ فرمایا :

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ — (اے نبیؐ) لوگوں سے درگذر کیجئے اور ان کے لیے بخشش مانگیے

ان آیات مبارکہ میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ کو دعوت حق میں جاہل گنواروں سے واسطہ پڑے گا۔ اسی لیے آپؐ کو ان لوگوں کی جہالت اور گنوارپن سے درگذر کرتے ہوئے انہیں نیکی کی تلقین کرنا ہوگی۔ چنانچہ آپؐ نے اپنی زندگی سے اس کا عملی نمونہ پیش کر دیا۔

جب آنحضرتؐ نے اپنے مشن کا آغاز کیا اور لوگوں کو دین اسلام کی طرف بلایا تو مشرکین مکہ نے آپؐ پر شدید مظالم ڈھائے اور آپؐ کو طرح طرح کی اذیتیں دیں لیکن رحمت دو عالمؐ نے نہ صرف دشمنان اسلام کے لیے بد دعا کرنے سے احتراز کیا بلکہ کمال عفو سے بارگاہ الٰہی میں ان کی ہدایت و فلاح کی دعا فرمائی۔

مدنی زندگی میں یہود نے آپؐ کے خلاف بہت سازشیں کیں اور بارہا آپؐ کو (معاذ اللہ) قتل کرنے کے ناپاک منصوبے بنائے۔ یہودی قبیلہ بنو نضیر نے آپؐ پر پتھر

گرا کر شہید کرنے کی سازش کی ، اور خیبر کی ایک یہودیہ نے آپ ؐ کو کھانے میں زہر ملا دیا ۔ لیکن آپ ؐ ہر بار انہیں معاف کرتے رہے ۔ اور صرف اس وقت انہیں قرار واقعی سزائیں دیں جب ان کی ریشہ دوانیاں حد سے بڑھ گئیں اور پانی سر سے گذر گیا

آپ ؐ مکہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور آپ ؐ کو اپنے جانی اور دیرینہ دشمنوں اور مخالفین اسلام پر مکمل غلبہ حاصل ہوا ۔ دنیا کا کوئی قانون کوئی ضابطہ اخلاق آپ ؐ کو ان لوگوں سے اپنی اذیتوں اور تکلیفوں کا پورا پورا بدلہ لینے سے مانع نہیں تھا لیکن آپ ؐ نے عام معافی کا اعلان کر دیا اور فرمایا ۔

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ ۔ جاؤ تم آزاد ہو آج کے دن تم پر کوئی سرزنش نہیں ۔ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرے ۔

آپ ؐ کی ذاتی زندگی میں عفو و درگذر کی مثالیں بے شمار ہیں لیکن ایک واقعہ کا تذکرہ ضروری ہے ۔ ایک مرتبہ آپ ؐ اپنی تلوار درخت پر لٹکائے وہیں سو رہے تھے کہ ایک کافر آیا تلوار سونت کر آپ ؐ کو جگایا اور کہنے لگا " اے محمد ! بتاؤ اب میرے ہاتھ سے آپ ؐ کو کون بچائے گا " آپ ؐ نے بلا خوف فرمایا " اللہ " یہ سنتے ہی تلوار اس کافر کے ہاتھ سے گر پڑی ۔ آنحضور ؐ نے تلوار اٹھائی اور فرمایا بتاؤ اب تجھے کون بچائیگا : وہ حیران رہ گیا تاہم آپ ؐ نے اس سے انتقام نہ لیا اور معاف کر دیا ۔

**۴ ۔ ارشادات نبوی :-** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف خود ہی عفو پر عمل کیا بلکہ صحابہ کرام ؓ کو اس کے اختیار کرنے کی تلقین فرمائی اور اپنی امت کو اس کی خاص ترغیب دی ہے

۱ ۔ اللہ تعالیٰ عفو و درگذر کرنے والوں کی عزت میں اضافہ کرتا ہے ۔ ( صحیح بخاری )

۲ ۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا " پہلوان وہ نہیں جو دوسروں کو پچھاڑ دے بلکہ وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے ۔ ( مسلم

۳۔ ایک شخص نے آنحضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ: میں اپنے خادم کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں آپ نے فرمایا ہر روز ستر مرتبہ (ترمذی)

۴۔ فرمایا مجھے میرے رب نے نو باتوں کا خاص طور سے حکم دیا ہے اور ان میں ایک بات آپ نے یہ فرمائی کہ مجھے حکم ہے کہ جو کوئی مجھ پر ظلم (زیادتی) کرے میں اس کو معاف کر دیا کروں۔ (صحیح بخاری)

## ۵۔ صفت مومنین۔ خدا تعالیٰ خود اپنے بندوں کی خطائیں معاف کرتا ہے

لغزشوں سے درگذر کرنا پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندے بھی آپس میں عفو و درگذر سے کام لیں چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا۔

فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا (۲: ۱۰۹) پس معاف کر دیا کرو اور درگذر کرتے رہا کرو

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے

قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللَّهِ (الجاثیہ) (اے نبی) اہل ایمان سے کہہ دو کہ ان لوگوں کو جو اللہ کے جزا و سزا کے دنوں کے امیدوار نہیں معاف کر دیا کریں۔

خدا تعالیٰ نے عفو و درگذر اختیار کرنے والے کی بہت تعریف فرمائی ہے

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ۔ اور جو صبر کرے اور معاف کر دے تو یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے

## عفو کے ثمرات و فوائد

عفو و درگذر اپنانے سے متعدد فوائد حاصل ہوتے ہیں

## ۱۔ معاشرہ کی سلامتی

عفو سے معاشرہ کی سلامتی اور استحکام برقرار رہتا ہے۔ انسانی معاشرے میں امن و سکون پیدا ہوتا ہے۔ باہمی حسد و بغض اور خصومت و عداوت کی فضا ختم ہو جاتی ہے اور باہمی خلوص و محبت کے جذبات نشوونما پاتے ہیں :-

**١٣- اشاعتِ اسلام میں اہمیت:-** اسلام کی اشاعت اور ترویج میں عفو کو نمایاں اہمیت حاصل ہے کیونکہ دشمنانِ اسلام جس قدر اس صفت سے متاثر ہوتے ہیں کسی اور چیز سے نہیں ہوتے۔ تاریخ گواہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو دشمنوں پر سب سے زیادہ عفو ہی کی بدولت کامیابی نصیب ہوئی۔

**١٤- خدا تعالیٰ کی رضا و مغفرت:-** عفو و بخشش خدا تعالیٰ کی پسندیدہ صفت ہے اس لیے خدا تعالیٰ اس صفت کے اپنانے والوں کو بھی محبوب رکھتا ہے اور ان کے گناہوں کو معاف کر کے عفو و مغفرت عطا کرتا ہے۔

## ۷- عدل

**مفہوم:-** عدل کے لغوی معنی سیدھا کرنا، برابر تقسیم کرنا، مساوات قائم کرنا اور توازن و تناسب پیدا کرنا ہیں۔ قرآن حکیم میں عدل کے لیے لفظ قسط بھی استعمال ہوا ہے جس کے معنی انصاف اور برابری کے ہیں۔ لیکن اصطلاحِ شریعت میں عدل سے مراد ہر چیز کو اس کے صحیح موقع و محل میں رکھنا اور زندگی کے ہر شعبہ میں توازن و تناسب قائم کرنا ہے۔ چنانچہ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری عدل کی تعریف میں لکھتے ہیں۔

"کسی چیز کو اس کے صحیح موقع و محل میں رکھنا عدل ہے اور اس کی ضد ظلم ہے جس کے معنی کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا ہے جو اس کے لائق نہ ہو۔"

اس تعریف کے لحاظ سے اچھائی یا برائی دونوں کا برابر کا بدلہ عدل کہلائے گا لیکن اچھائی کا زیادہ بدلہ "احسان" اور برائی کا زیادہ بدلہ ظلم ہوگا۔

درحقیقت عدل سے مراد زندگی کے تمام شعبوں یعنی انفرادی و اجتماعی معاملات

معاشی، عدالتی و سیاسی وغیرہ میں حقوق کی متوازن و متناسب تقسیم سے

## عدل کی اہمیت

عدل کی اہمیت کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جاتا ہے۔

**۱۔ تقاضائے فطرت:۔** عدل فطرت کا تقاضا ہے اور کائنات کا سارا نظام اسی وجہ سے قائم ہے۔ کارخانہ کائنات کے تمام اجزاء متوازن و متناسب ہیں اگر ان میں ذرا سا بھی عدم توازن پیدا ہو جائے تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ مثلاً نظام شمسی عدل کے اصول پر قائم ہے۔ اجرام فلکی اپنے اپنے دائروں میں خاص رفتار سے گردش کر رہے ہیں اگر ایک سیارہ دوسرے کے دائرہ عمل میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اسی طرح انسانی جسم بھی عدل ہی کا مرہون منت ہے۔ کیونکہ جب انسانی اعضاء و قویٰ میں توازن و تناسب نہیں رہتا تو صحت بگڑ جاتی ہے اور انسان بیمار ہو جاتا ہے۔

دراصل عدل کا مقصد انسان کو افراط و تفریط سے بچا کر زندگی کے صحیح و معتدل راستے پر گامزن کرنا ہے۔ عدل کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے دین پر چلنے والوں کو "امت وسطاً" یعنی اعتدال کی امت قرار دیا ہے۔

**۲۔ قرآن پاک میں تاکید:۔** عدل سب سے پہلے خود خدا تعالیٰ کی صفت ہے خدا اس کے اسماء الحسنیٰ میں ایک نام عادل بھی ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو بھی عدل اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (النحل ۹۰) — بیشک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

عدل صرف انتظام سلطنت کے لیے ہی درکار نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا اختیار کرنا لازمی ہے۔ اس لیے قرآن پاک میں زندگی کے ہر پہلو میں اسے اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

۲۔ اسوۂ رسولؐ :- خدا تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عدل اختیار کرنے کی تاکید کی ہے جیسا کہ فرمایا :-

وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۔ (اے نبیؐ کہہ دیجئے کہ) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں (الشوریٰ ۱۵)

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اس ارشاد خداوندی کے پیش نظر امیر و غریب عربی و عجمی، غلام و آزاد اور مسلم و کافر کسی قسم کا امتیاز یا لحاظ نہ رکھا۔ بلکہ ہر شخص کو اس کا صحیح حق دلوایا۔

آپؐ نے منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد ہی یہ صفت اختیار نہیں کی بلکہ ابتدا ہی سے آپؐ پیکر عدل و انصاف تھے اور آپؐ کے دشمنوں کو بھی ہمیشہ آپؐ کے عدل پر اعتماد رہا۔ چنانچہ مشرکین مکہ اپنے جھگڑے آپؐ کے پاس فیصلہ کے لیے لاتے تھے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر نو میں حجر اسود کے نصب کرنے پر قبائل قریش میں نزاع پیدا ہوا یہاں تک کہ تلواریں نیاموں سے نکل آئیں۔ بالآخر معاملہ آپؐ کے پاس لایا گیا اور آپؐ نے نہایت خوش اسلوبی سے یہ جھگڑا طے کر دیا۔

آپؐ کی سیرت طیبہ میں عدل و انصاف کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں :-

ایک مرتبہ بنی مخزوم کے ایک معزز گھرانے کی فاطمہ نامی ایک عورت نے چوری کی۔ مقدمہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا۔ قریش

نے محسوس کیا کہ اگر اس عورت کو سزا مل گئی تو ان پر حرف آئے گا۔ چنانچہ انہوں نے آپؐ کے غلام زادے حضرت اسامہ بن زیدؓ کے ذریعے سفارش کرائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو اسامہؓ سے سخت خفا ہوئے اور فرمایا تم سے قبل بنی اسرائیل اسی وجہ سے برباد ہوئے کہ وہ بارسوخ آدمیوں کے معاملات میں نرمی برتتے تھے اور غرباء کے معاملوں میں سختی کر کے انہیں سزا دیتے تھے۔ پھر آپؐ نے فرمایا خدا کی قسم! اگر میری اپنی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جاتا۔ چنانچہ آپؐ کے حکم کے مطابق اس عورت کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں بھی قیام عدل پر بہت زور دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن امام عادل پر خدا کا سایہ ہوگا۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن امام عادل کا درجہ سب سے بلند ہوگا۔ نیز آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ حاکم عادل کی دعا قبول ہوتی ہے۔

ایک موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے کہ رضا اور ناراضگی دونوں حالتوں میں کلمۂ عدل کہوں۔ ایک روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ ایزدی میں دعا کیا کرتے تھے کہ "اے اللہ! مجھے فقر و غنا دونوں حالتوں میں اعتدال عطا کر۔"

**ثمرات و فوائد** عدل کے مندرجہ ذیل ثمرات و فوائد ہیں:۔

**۱۔ استحکام معاشرہ:۔** عدل کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے معاشرے کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ حقدار کو اس کا حق مل جاتا ہے اور وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ ظالم کو اس کے ظلم کی سزا مل جاتی ہے اور آئندہ وہ کسی پر ظلم کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

بھائی چارہ اخوت یہ عمل ایک بہت بڑی اخلاقی فضیلت ہے جس کا آخرت میں بہت بڑا اجر ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں خاص مقام حاصل ہے چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ اپنے گھر والوں میں یا ان میں جن کی حکومت ان کے ذمہ کی گئی ہے انصاف کرتے ہیں وہ خدا کے پاس نور کے منبروں پر ہونگے (ریاض الصالحین) ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن امام عادل پر خدا کا سایہ ہوگا۔

# ۸۔ احسان

**مفہوم** احسان کا مادہ حسن ہے جس کے معنی کسی کام کو خوبی و عمدگی سے سرانجام دینا ہے۔ قرآن مجید میں احسان کے لیے حسنہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی نیکی اور بھلائی کے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں احسان سے مراد وہ عمل ہے جو اس خوبی و عمدگی سے انجام دیا جائے کہ خدا تعالیٰ اور اس کے بندوں کو محبوب ہو۔

احسان وسیع معنوں میں نیکی کو کہتے ہیں جسے خوب تر طریقہ پر انجام دیا گیا ہو مثلاً دوسروں سے عمدہ سلوک کرنا، ہر وقت خوش خلقی سے پیش آنا، انعام و اکرام دینا، فیاضی و سخاوت کا برتاؤ کرنا، دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کم لینا سب احسان میں شامل ہیں۔ اسلام جہاں یہ تقاضا ہے کہ زیادہ سے زیادہ نیکی کی جائے وہاں یہ بھی چاہتا ہے کہ ہر نیکی خوب تر طریقہ پر کی جائے۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اچھے ہر عمل کے بارے میں یہ سمجھ کر یہ آخری عمل ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان ہر نیک کام کو اپنی استطاعت کے مطابق زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ پر انجام دے تاکہ وہ احسان شمار کیا جائے۔

احسان کا مفہوم عدل و انصاف سے زیادہ وسیع ہے۔ عدل سے مراد کسی کو اس کا پورا پورا حق دینا ہے لیکن احسان یہ ہے کہ دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دیا جائے اور خود اپنے حق سے کم لیا جائے۔ زیادہ واضح الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کسی معاملہ میں برابر کا بدلہ لینا یا دینا عدل ہے لیکن سزا دینے کی بجائے معاف کر دینا اور عمدہ سلوک سے پیش آنا احسان کہلاتا ہے۔

**اہمیت** احسان کی اہمیت کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جا سکتا ہے۔

**۱۔ حسن معاشرہ:۔** معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں احسان کو عدل سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک صالح معاشرہ کے قیام و بقا کا انحصار عدل پر ہوتا ہے لیکن اس میں حسن و جمال اور خوبصورتی و نکھار احسان ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ عدل اگر معاشرے کو تلخیوں اور ناگواریوں سے محفوظ کرتا ہے تو احسان اس میں خوشگواریاں اور شیرینیوں کو جنم دیتا ہے۔

درحقیقت معاشرتی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ہر شخص ناپ تول کر اپنا حق پہچانتا رہے اور اسے لیکر ہی رہے اور اسی طرح دوسرے کا حق ناپ تول کر فقط اتنا ہی دے۔ اس قسم کے ماحول میں یہ تو ممکن ہے کہ کوئی تنازعہ یا کشمکش نہ ہو لیکن افراد میں باہمی خلوص و یگانگت، الفت و محبت، ایثار و قربانی، وفاداری و ہمدردی اور فیاضی و عالی ظرفی جیسے اعلیٰ جذبات مفقود ہوں گے جو دراصل زندگی کی روح ہیں۔ ان صفات کا وجود اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب انسان دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دے اور خود اپنے حق سے کم لے۔ اسی چیز کا نام احسان ہے۔

**۲۔ قرآن پاک میں تاکید:۔** قرآن مجید میں جابجا احسان کی اہمیت و ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ والدین و اقارب، یتیم و محتاج اور ہمسایہ و مسافر سے تمام لوگوں تک سب کے ساتھ

حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے ۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل ۹۰) بیشک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔

خدا تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ میں ایک نام محسن بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ سے بڑھ کر کون محسن ہو سکتا ہے ؛ جس کے بنی نوع انسان پر احسانات اسقدر زیادہ ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ زمین سے آسمان تک اور فرش سے عرش تک جو کچھ بھی ہے سب اسی کے احسانات کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ خود اپنی مثال دے کر بندوں کو آپس میں احسان کرنے کا حکم دیتا ہے جیسا کہ فرمایا

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (القصص ۷۷) اور احسان کر جیسا کہ خدا نے تجھ پر احسان کیا۔

**آنحضور کا قول و عمل** :۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ احسان کا کامل نمونہ تھی آپ نے نہ صرف اپنوں سے بلکہ دشمنوں سے بھی ہمیشہ احسان کا سلوک کیا۔

غزوہ بدر میں مشرکین مکہ کے قیدی آپ کے ہاتھ آئے۔ ان سے بڑھ کر آپ کا اور کوئی دشمن نہ تھا۔ اور باوجودیکہ صحابہ کرامؓ نے ان کے قتل کا مشورہ دیا۔ آپؐ نے نہ صرف انہیں رہا کر دیا بلکہ جتنی دیر یہ لوگ حضورؐ کی قید میں رہے آپؐ نے ان سے مہمانوں کی طرح سلوک کیا اور ان کے آرام و آسائش کا ہر طرح خیال رکھا۔

ابوسفیان جو قبول اسلام سے پیشتر اسلام کے سب سے بڑے دشمن تھے فتح مکہ کے موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف انہیں معاف کر دیا بلکہ یہ بھی اعلان فرمایا کہ جو شخص بھی ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا وہ بھی امن میں ہو گا۔ اس کے علاوہ ابوسفیان اور ان کے بیٹوں کو ہوازن کے مال غنیمت میں سب سے زیادہ حصّہ دیا۔

ایک دفعہ ایک بدو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے آپؐ کی چادر کو اتنے زور سے کھینچا کہ آپؐ کی گردن پر نشان پڑ گیا پھر بولا اے محمدؐ! خدا کا یہ مال جو آپ کے پاس ہے اس میں سے ایک بار شتر مجھے بھی دیجئے آپؐ نے کچھ دیر تامل کیا پھر فرمایا "مال بیشک اللہ کا ہے" پھر فرمایا کہ اسے ایک اونٹ پر کھجوریں اور ایک پر جو دیئے جائیں۔

**احسان کے ثمرات و فوائد** احسان کے مندرجہ ذیل ثمرات و فوائد ہیں:۔

۱۔ **تعمیر معاشرہ**:۔ احسان سے افراد معاشرہ میں باہمی خلوص و محبت، الفت و یگانگت اور اخوت و بھائی چارے کی فضا پروان چڑھتی ہے۔ آپس کے کینے، تنازعے، بغض اور حسد ختم ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کیلئے ایثار و قربانی اور ہمدردی و جاں نثاری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ دشمن دوست بن جاتے ہیں اور معاشرہ ترقی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔

۲۔ **خدا کی رضا و رحمت**:۔ خدا تعالیٰ خود محسن حقیقی ہے۔ اس لیے وہ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے ان پر اپنی رحمت خاص کرتا ہے اور انہیں مزید نعمتوں سے مالا مال کرتا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (البقرہ ۱۹) بیشک اللہ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

۳۔ **اجر آخرت**:۔ احسان کرنے والوں کو آخرت میں بہت بڑا اجر ملے گا جیسا کہ ارشاد ربانی ہے لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۔ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے احسان کیا اور تقویٰ اختیار کیا اجر عظیم ہے۔

# ۹۔ خدمت خلق

**مفہوم** خدمت خلق کے معنی مخلوق باری تعالیٰ کے کام آنا ہے لیکن اصطلاح میں اس سے مراد خدا تعالیٰ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لیے بغیر کسی اجرت، صلہ یا معاوضہ اس کی مخلوق کے کام آنا اور امداد و اعانت کرنا ہے۔

خدمت خلق کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ اس میں اپنے پرائے مسلم غیر مسلم سب شامل ہیں حتیٰ کہ جانوروں سے شفقت کا سلوک کرنا بھی خدمت خلق میں شامل ہے۔ الغرض تمام وہ امور جن سے انفرادی یا اجتماعی لحاظ سے قوم و ملت کی اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور روحانی زندگی میں مدد ملے سب کے خدمت خلق میں شامل ہیں۔

**اہمیت** خدمت خلق کی اہمیت کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ **معاشرتی فلاح و کامرانی**:۔ خدمت خلق کا جذبہ معاشرے کی بہتری، باہم محبت

بھی ہے کیونکہ یہی جذبہ کسی قوم کی کامرانی و کامیابی کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اگر کسی قوم کے افراد میں خدمت خلق کا جذبہ ختم ہو جائے ہر شخص نفسا نفسی کے عالم میں ہو اور لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک نہ ہوں تو گروہ زدار اور غریب و مفلس روم توڑنے لگیں اور پوری قوم تباہی و بربادی کی طرف گامزن ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام خدمت خلق کو ایک مقصد کی حیثیت سے پیش کرتا ہے تاکہ اسلامی معاشرہ ایک مثالی معاشرہ بن سکے اور امت مسلمہ دنیا کی بہترین امت قرار پا سکے۔

**۲۔ قرآن مجید میں تلقین:۔** قرآن پاک میں مختلف طریقوں سے خدمت خلق کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ ایک مقام پر نیک لوگوں کا وصف خدمت ٹھہرایا ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۔ (۲۹ : ۱۹)

اور وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے مسکین یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر خدمت خلق کی ایک صورت یعنی انفاق فی سبیل اللہ کی یوں ترغیب دی گئی

مَن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ (الحدید۔ ۱۱)

اور کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دے اور یہ اس کیلئے کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور اس کے لیے پسندیدہ اجر ہے۔

قرآن پاک میں جابجا لوگوں میں اصلاح کرانے کی بھی تلقین کی گئی ہے جس سے خدمت خلق کی اہمیت و فضیلت واضح ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

وَتُصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ

اور لوگوں کے درمیان اصلاح کرو۔

**۳۔ امثال نبوی:۔** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی خدمت خلق کا بہترین نمونہ ہے۔ بنی نوع انسان کی ہمدردی و خیر خواہی آپ کی فطرت تھی اور ہر واقف و ناواقف کی خدمت آپ کا شعار تھا۔

آپ اپنے گھر کے تمام کام کاج خود کرتے تھے۔ پھٹا ہوا کپڑا اسی لیتے۔ جوتا مرمت کر لیتے

گھر کی صفائی کر دیتے اور اونٹ بکری وغیرہ پالتو جانور کو خود کھول باندھ دیتے تھے اپنے
کام تو درکنار آپؐ نے کبھی دوسروں کے کام کو بھی عار نہیں سمجھا بلکہ خوشی محسوس کی۔
آپؐ ہمیشہ دوسروں کی تکلیف دیکھ کر بے چین ہو جاتے۔ بیماروں کی عیادت کرتے
محتاجوں غریبوں کی مدد کرتے اور بھوکوں اور مسافروں کو کھانا کھلاتے۔ غلاموں کے
ساتھ شفقت کا برتاؤ کرتے اور دوسروں کے حقوق کی حفاظت و نگہداشت کرتے۔
غرضیکہ آپؐ کی زندگی کا ہر پہلو خدمت خلق کا مظہر ہے چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ مشہور صحابی حضرت خبابؓ کے گھر میں دودھ دوہنے والا کوئی مرد نہ تھا۔ اور
عورتیں بھی دودھ دوہنا نہ جانتی تھیں۔ پس حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز
ان کے گھر دودھ دوہنے جایا کرتے تھے۔

۲۔ ایک روز آپؐ نماز کے لیے کھڑے ہوئے کہ ایک بدو آیا آپؐ کا دامن پکڑ کر بولا
میرا کچھ کام رہ گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بھول جاؤں پہلے اسے کر دیں۔ حضورؐ فوراً اس کے
ساتھ نکلے اور اس کا کام پورا کر کے نماز ادا کی۔

۳۔ حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی طرف سے دربار نبوی میں کچھ مہمان آئے۔
آپؐ خود ان کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم ہم خدمت کے لیے حاضر ہیں آپؐ تکلیف نہ فرمائیں۔ مگر حضورؐ نے فرمایا
کہ ان لوگوں نے میرے دوستوں یعنی مہاجرین حبشہ کی خدمت کی ہے اس لیے
میں خود ہی ان کی خدمت کروں گا۔

۴۔ اسی طرح جب ۹ھ میں طائف کا وفد حاضر ہوا تو آپؐ نے خود اپنے ہاں اسے
مسجد نبوی میں اتارا اور خدمت کی حالانکہ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے آپؐ کو
طائف کے بازار میں پتھر مار مار کر لہو لہان کر دیا تھا۔

**۴- ارشاداتِ نبوی ؐ:-** حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد احادیث مروی ہیں جن میں آپ ؐ نے خدمتِ خلق کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ چند احادیث درج ذیل ہیں۔

۱- آپ ؐ نے فرمایا کہ مجھے رمضان بھر کے روزے رکھنے اور اس جیسے مسجدِ حرام میں اعتکاف بیٹھنے سے یہ زیادہ عزیز ہے کہ میں اپنے بھائی کی بوقتِ ضرورت مدد کروں (کنز العمال)

۲- آپ ؐ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو دوسرے کے درد کا احساس نہیں اور جس کا دل دوسرے کی مصیبت دیکھ کر نہیں پسیجتا وہ ہرگز خدا کی رحمت کا مستحق نہیں تمہیں مخلوق پر مہربانی کرنی چاہیئے تاکہ خالق اکبرتم پر مہربان ہو۔

۳- آپ ؐ نے فرمایا کہ بھولے، بھٹکے یا اندھے کو راستہ بتانا بھی کارِ ثواب ہے۔

۴- ایک دوسرے موقع پر آپ ؐ نے ارشاد فرمایا کہ راستے سے کانٹا یا دوسری ایذا رساں چیز کو ہٹا دینا بھی کارِ خیر ہے۔

۵- حضور ؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مخلوق خدا کا کنبہ ہے پس بہترین شخص مخلوق میں وہ ہے جو خدا کے کنبے کے ساتھ احسان کی روش اختیار کرے (بیہقی)

**فوائد و ثمرات** خدمتِ خلق کے دنیا و آخرت ہر دو جگہ بے شمار فوائد ہیں۔ (۱) اس سے انسانوں میں باہمی ہمدردی و تعاون کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں کو مشکلات و مصائب سے نجات ملتی ہے اور خوشحال زندگی کا ماحول پیدا ہوتا ہے (۲) آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے دکھ و مصائب دور کرے گا۔ ان کے گناہوں میں کمی کر دے گا اور ان کی مغفرت کرے گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک شخص نے راستہ سے شاخ ہٹا دی تو اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا (مسلم)

باب ۴

# آداب اسلامی

- ملاقات
- گفتگو
- شرب و طعام
- لباس
- مجلس

# آداب

**مفہوم** آداب جمع ہے ادب کی جس کے معنی ہیں دانائی، دانشمندی، کسی کام کا سلیقہ اور حسن استعمال۔ اصطلاح میں آداب سے مراد وہ طور طریقے ہیں جو انسانی زندگی کے روزمرہ مشاغل مثلاً اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، رہنے سہنے، کھانے پینے اور دیگر کے لیے جاتے ہیں کہ بطریق احسن انجام دینے کے لیے ضروری ہیں۔ گویا آداب نیک اور عمدہ و شائستہ اعمال کو اپنانے اور قبیح افعال سے بچنے کا نام ہے۔

آداب در حقیقت اس اصول پر مبنی ہیں کہ روزمرہ کے مشاغل اس طرح بجا لائے جائیں کہ زیادہ سے زیادہ افراد کو آرام ملے اور کسی طرح کی تکلیف یا ناگواری پیدا نہ ہو۔

**اہمیت** اسلام نے انسانی زندگی کا جو نقشہ مرتب کیا ہے اس میں آداب کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ بلکہ بنظر غائر دیکھا جائے تو گویا دین آداب اور تہذیب و شائستگی ہی سے عبارت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ وَ اَدَّبَنِیْ
رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ۔

میرے رب نے مجھے علم دیا تو بہت اچھا علم دیا اور
میرے رب نے مجھے ادب سکھایا تو بہت اچھا ادب سکھایا

اس حدیث میں حضور ؐ نے ادب کا ذکر علم سے الگ کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آداب کو اسلام میں ایک مستقل مقام حاصل ہے۔

آداب وحشی اور متمدن لوگوں میں امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ آداب انسانی زندگی کو مہذب، شائستہ اور باسلیقہ بناتے ہیں۔ آداب کے بغیر نہ تو کوئی قوم ترقی کر سکتی ہے اور نہ ہی کسی قوم میں ہم آہنگی و یکجہتی پیدا ہو سکتی ہے۔ آداب سے محروم قوم انسانوں کی جماعت نہیں بلکہ حیوانوں کا ریوڑ ہوتی ہے جسے جس طرف چاہے ہانک دیا جائے۔ ایسی قوم میں اتحاد کی بجائے انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

لہٰذا آداب ہی وہ دولت ہیں جو کسی قوم کی خوشحالی متعین کرتے ہیں اور اسے ترقی کی معراج کی منازل سے ہمکنار کرتے ہیں۔

**فوائد:** آداب کے مندرجہ ذیل اہم فوائد ہیں:

۱۔ آداب انسان میں شائستگی اور تہذیب پیدا کرتے ہیں اور اسے با سلیقہ بناتے ہیں۔

۲۔ آداب کی بدولت انسان اپنے اور دوسروں کے مرتبہ کو پہچانتا ہے اور حدود سے تجاوز نہیں کرتا۔

۳۔ آداب اخلاق کے محافظ و نگہبان ہوتے ہیں اور اکتساب فضائل و محاسن کا اہم ذریعہ ہیں۔

۴۔ آداب اجتماعی حیثیت سے بھی [illegible] جس سے قوم میں یکجہتی و ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا ہوتی ہے۔

## ۱۔ آدابِ ملاقات

**مفہوم:** یہ ایک فطری امر ہے کہ جب انسان کسی دوسرے جاننے والے سے ملاقات کرتا ہے تو کسی نہ کسی صورت میں محبت اور بشاشت کا اظہار ضرور کرتا ہے۔ ایسے مواقع پر اظہارِ بشاشت کیلئے عام طور پر مختلف الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جو ہر قوم اور مذہب میں اپنے اپنے رواج کے مطابق الگ الگ ہیں۔ انگریز "گڈ مارننگ"، ہندو "نمستے" اور سکھ "واہ گورو" وغیرہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن مسلمان بلا امتیاز قوم و ملک اور رنگ و نسل "السلام وعلیکم" کہتے ہیں جس کے معنی ہیں "تم پر سلامتی ہو"۔

**اہمیت و ضرورت:** اسلام چونکہ زندگی کے ہر گوشہ میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے اور ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جو بالکل فطری ہو اس لئے تمدن کا یہ شعبہ بھی کسی لحاظ سے اسلام کی رہنمائی سے محروم نہیں۔ چنانچہ اسلام کا یہ تاکیدی حکم ہے کہ جب مسلمان آپس میں ملیں تو دوسرے مذاہب یا دوسری اقوام کی

پیروی کرنے کی بجائے "السلام علیکم" کہیں۔ اسلام میں آداب کا یہ طریق اس قدر مکمل ہے کہ اس میں سراسر خیر و برکت دکھائی دیتی ہے۔ فریقین کی طرف سے سلام اور جواب سلام کہا۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کے خواہشمند ہیں۔ کیونکہ پہلا شخص "السلام علیکم" کہکر سلامتی کا ذکر کرتا ہے اور تم پر سلامتی کی دعا مانگتا ہے۔ اور دوسرا شخص اس کے جواب میں تسلیم کرتے ہوئے "وعلیکم السلام" کہتا ہے جس کے معنی یہ ہیں "تم پر بھی ہر طرح کی سلامتی ہو"۔ گویا دونوں طرف سے باہمی سلامتی کی خواہش کا اظہار ہوگا اور اسی کا ہر شخص متمنی ہے۔

آداب ملاقات کے وقت سلام کہنے کے اسلام نے مندرجہ ذیل اصول بیان کئے ہیں

۱۔ دعائے خیر ہے "سلام" کہنے کا حکم قرآن مجید میں یوں دیا گیا ہے کہ "وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا"۔ "اور جب تم کو کسی طرح بھی سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر سلام کر دیا کرو یا کم سے کم ویسا ہی جواب دو"۔ پھر ایک دوسری جگہ یہ ارشاد فرمایا "فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً" (جب تم گھروں میں جانے لگو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو۔ یہ ایک دعائے خیر ہے جو تم کو خدا کی طرف سے تعلیم کی گئی ہے برکت والی اور پاکیزہ)۔ ان آیات میں "سلام" کو دعائے خیر و برکت بتا دیا گیا ہے اور سلام کہنا اور سلام کا جواب دینا ہر مسلمان پر لازمی قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ تکمیل ایمان اور حق اسلام:- ان احکام قرآنی کی وضاحت میں نبی کریمؐ کے بیشمار ارشادات کتب احادیث میں "باب السلام" کے تحت مذکور ہیں۔ سرکارِ دو عالمؐ نے سلام کہنا مسلمان ہونے کیلئے شرط قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں رسول اللہؐ نے فرمایا ہے "تم اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہوگے جب تک ایمان نہ لاؤ اور اس وقت تک تمہارا ایمان مکمل نہ ہوگا جب تک تم آپس میں محبت نہ کرو۔ کیا میں تم کو ایسی بات نہ

ہے تو کہنے والے اور جواب دینے والے دونوں کا آپس میں مصافحہ کرنا عزت و محبت
اور مودت کا باعث ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو امامہؓ کہتے ہیں رسول اللہ نے فرمایا ہے
مریض کی پوری عیادت یہ ہے کہ تم اپنا ہاتھ مریض کی پیشانی یا اس کے ہاتھ پر رکھ کر
اس سے اس کا حال پوچھو۔ اور پورا سلام کرنا یہ ہے کہ سلام کے بعد تم مصافحہ بھی کرو۔
آنحضرت کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جو شخص غیروں کے ساتھ مشابہت کرے وہ ہم میں سے نہیں
ہے۔ تم نہ تو یہود کے ساتھ مشابہت کرو اور نہ نصاریٰ کے ساتھ۔ یہودی انگلی
کے اشارے سے سلام کرتے ہیں اور نصاریٰ ہتھیلیوں کے اشارہ سے۔ مسلمانوں
کو زبان سے سلام کرنے اور ہاتھ سے مصافحہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

**غیر مسلموں سے سلام** — غیر مسلموں سے سلام لینے کے سلسلے میں اسلام
نے دو شرطیں عائد کی ہیں۔ اول یہ کہ غیر مسلموں سے سلام میں پہل نہ کی جائے جس کا
مقصد یہ ہے کہ اسلام کی برتری اور بڑائی قائم رہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت
ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا "یہود اور نصاریٰ کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو۔" البتہ اگر
غیر مسلموں کے کسی مجمع میں کوئی مسلمان بھی ہو تو پہل کرنے کی اجازت ہے چنانچہ
حضرت اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ رسول اللہ ایک ایسے مجمع کے پاس سے گزرے جس
میں مسلمان، مشرک، بت پرست اور یہود ہر قسم کے آدمی تھے اور آپؐ نے ان
کو سلام کیا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ غیر مسلموں کے سلام کے جواب میں صرف "وعلیکم"
کہا جائے۔ جس کی وضاحت بخاری و مسلم کی اس روایت سے ہوتی ہے جو حضرت
عائشہؓ سے مروی ہے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ یہود کی ایک جماعت نے نبی کریمؐ
کی خدمت میں حاضری کی اجازت طلب کی اور کہا "السام علیکم" (یعنی تم کو موت
آئے) میں نے ان کے جواب میں کہا "بل علیکم السام واللعنة" (بلکہ تم کو موت آئے
اور تم پر لعنت ہو) نبی کریمؐ نے فرمایا کہ عائشہ خدا تعالیٰ نرمی کرتا ہے اور نرمی

کو تمام امور میں پسند کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا آپؐ نے سنا نہیں انہوں نے کیا کہا تھا
آپؐ نے فرمایا میں نے اس کے جواب میں "وعلیکم" (یعنی تم پر بھی) کہہ دیا تھا۔

**۲۶۔ جواب سلام** :۔ سلام ہمیشہ بہتر طریقہ پر کرنا چاہیئے اور اس کا جواب بھی عمدہ طریقہ پر دینا چاہیئے۔ حضرت عمرانؓ بن حصین سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر "السلام علیکم" کہا۔ آپؐ نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ پھر وہ شخص بیٹھ گیا۔ حضورؐ نے فرمایا اس شخص کے لیے دس نیکیاں لکھی گئیں۔ پھر ایک اور شخص آیا اور کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" آپؐ نے اس کو بھی سلام کا جواب دیا اور اس کے بیٹھ جانے پر فرمایا اس کے لیے بیس نیکیاں لکھی گئیں۔ پھر ایک اور شخص آیا اور کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" آپؐ نے اس کے سلام کا بھی جواب دیا اور اس کے بیٹھ جانے پر فرمایا اس کے لیے تیس نیکیاں لکھی گئیں۔ حضرت معاذؓ بن انس نے اس حدیث میں یہ الفاظ زیادہ کئے ہیں کہ پھر ایک اور شخص آیا اور کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ" آپؐ نے فرمایا اس شخص کے لیے چالیس نیکیاں لکھی گئیں۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا اور اسی طرح سے ثواب بڑھتا جاتا ہے۔

**فوائد و ثمرات** آداب کہنے کا یہ طریقہ جو اسلام نے سکھایا ہے صلح و امن اخوت و مساوات اور برکت کا وہ واحد ذریعہ ہے جس کا مقابلہ دنیا کا کوئی طریقہ آداب نہیں کر سکتا۔ مگر اس کے باوجود ہمارا یہ عالم ہے کہ اسلام کے اس بہترین و مسنون طریقہ کو چھوڑ کر نت نئے طریقے اختیار کر رکھے ہیں مثلاً "آداب عرض" "بندگی" "سلامتی" "تسلیمات عرض" "ہیلو" "گڈ نائٹ" وغیرہ الفاظ جو سلام کی جگہ استعمال کئے جاتے ہیں نہ صرف بے مقصد ہیں بلکہ دلپسند بھی نہیں لہذا ضروری ہے کہ انہیں ترک کر کے سلام کا مسنون طریقہ رائج کیا جائے اور یہی

بلکہ دینی و دنیاوی بہتری کا موجب ہے۔

## ۲۔ آدابِ گفتگو

**مفہوم** ایک دوسرے سے ہم کلام ہونے اور بات چیت کرنے کے طور طریقے آدابِ گفتگو کہلاتے ہیں۔

**اہمیت و ضرورت** گفتگو ایک معاشرتی و تمدنی ضرورت ہے۔ انسان جب ایک معاشرے میں رہتا ہے اور دوسروں سے مل جل کر زندگی بسر کرتا ہے تو لازماً دوسروں سے ہم کلام ہونے کے مواقع آتے ہیں جیسے مواقع پر گفتگو ایسی ہونی چاہیئے کہ ماحول خوشگوار رہے اور کسی طرح کی رنجیدگی یا دل شکنی پیدا نہ ہو اسی بنا پر آدابِ گفتگو متعین کیے جاتے ہیں۔

**آداب** قرآن و حدیث میں جو آدابِ گفتگو بیان ہوئے ہیں ان میں سے بعض اجمالی ہیں اور بعض تفصیلی۔ ان آداب کی تفصیل یہ ہے

۱۔ **نرمی**:۔ آدابِ گفتگو میں سب سے اولین اصول یہ ہے کہ بات نہایت نرمی اور سلیقے سے کی جائے اور کسی طرح بھی ترش یا سخت لہجہ اختیار نہ کیا جائے۔ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو فرعون کی طرف بھیجتے وقت ہدایت ہوئی ہے۔

فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا (طٰہٰ) (تو تم اس سے نرم بات کرنا)

ایک دوسرے سے تلخ و درشت لہجے اور چیخ چیخ کر بات کرنے سے یوں منع فرمایا ہے۔

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ۔ (لقمان)

(اور اپنی آواز کچھ آہستہ رکھ کیونکہ بے آوازوں میں بری آواز گدھوں کی ہے)

۲- نیک بات:- گفتگو کا عنوان ہمیشہ نیکی، اچھائی اور بھلائی ہونا چاہیئے یعنی ایسی بات کہنی چاہیئے جس سے اپنا اور سب کا بھلا مقصود ہو۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرہ) (اور لوگوں سے اچھی بات کہو)

قرآن حکیم نے نیک بات کہنے کو صدقہ کے مترادف قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا أَذًى (البقرہ) (نیکی کی بات اور درگذر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل کا آزار ہو)

آنحضرت نے بھی ارشاد فرمایا جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیئے کہ وہ نیک بات کہے یا چپ رہے۔

۳- عدل:- گفتگو میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے اور ایسی بات کہنی چاہیئے جو منصفانہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (الاحزاب) (اے ایمان والو اللہ سے تقویٰ اختیار کرو اور بات سیدھی کہو، اللہ تمہارے تمام اعمال سنوارے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا)

۴- واضح بات:- گفتگو بہت واضح ہونی چاہیئے جو مخاطب کو باسانی سمجھ آسکے۔ ہر بات کو صفائی اور سہولت سے کہا جائے اور ضروری ہو تو بات کو دوہرا کر بیان کیا جائے۔ حدیث ہے کہ حضور اکرمؐ اہم بات کہتے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے اور اتنی جلدی جلدی نہ کہتے کہ مخاطب ہر لفظ کا مفہوم نہ سمجھ پائے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت تیزی سے گفتگو نہیں کرتے تھے بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپؐ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا۔ ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ کے کلام میں ترتیل اور ترسیل پائی جاتی تھی یعنی ہر لفظ الگ

الگ ہوتا تھا اور بات مخاطب کو آسانی سمجھ آتی تھی۔

۵۔ **اختصار:**۔ گفتگو مختصر کرنی چاہیئے اور لمبی لمبی تقریروں اور لایعنی جملوں سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی حضرت عمرو بن العاصؓ نے سنا تو فرمایا اگر یہ میانہ روی اختیار کرتا تو اسکے لیے بہتر ہوتا کیونکہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ گفتگو میں اختصار بہتر ہے۔

۶۔ **حفاظت زبان:**۔ گفتگو میں سب سے اہم اصول یہ ہے کہ بات بقدر ضرورت کرنی چاہیئے اور زبان کو بے لگام نہ ہونے دینا چاہیئے کیونکہ اس طرح بعض اوقات گفتگو خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جو بھی لفظ زبان سے نکالا جائے اس کا اچھا یا بُرا نتیجہ ضرور مرتب ہو گا۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (ق) (آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا مگر ایک نگران اس پر حاضر رہتا ہے)

آنحضورؐ نے بھی فرمایا ہے کہ ایک بات سے یا تو اللہ کی تاقیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے اور یا اس کی تاقیامت ناراضگی ہاتھ آتی ہے۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو دونوں جبڑوں کے بیچ یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا وہ جنت میں جائے گا۔

۷۔ **بامقصد بات:**۔ گفتگو ہمیشہ بامقصد ہونی چاہیئے لغو، لایعنی اور فضول و بیکار باتوں سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ قرآن حکیم نے مسلمانوں کی یہ صفت بیان کی ہے کہ:

وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ (مومنون) (اور جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں)

اگر مخاطب لغو، لایعنی باتیں کر رہا ہو تو قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ گفتگو ختم کر دی جائے۔ فرمایا

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا (فرقان) (اور جب نا سمجھ ان کو مخاطب کرتے ہیں تو وہ سلام کہتے ہیں)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایسے لوگ جو فضول باتیں کرتے جھگڑا اور لغویات میں مبتلا رہتے ہوں وہ امت کے بدترین افراد ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو مطلب نہ ہو ادھر توجہ نہ دے۔

۸۔ **بُرا نہ کہنا:**۔ گفتگو میں یہ جائز نہیں کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو بُرا کہے البتہ اگر وہ مظلوم ہو تو ایسا کرنے کی اجازت ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے:۔

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔ (النساء)

(اللہ کو یہ پسند نہیں کہ کوئی کسی کو منہ پھاڑ کر برا کہے مگر جس پر ظلم ہوا ہو۔)

۹۔ **فحش کی ممانعت:**۔ اسلام فحش و بے حیائی کی باتوں سے بھی سختی سے منع کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ (الانعام)

(اور بے حیائی کی باتیں جو ظاہر ہوں اور جو پوشیدہ ہوں ان میں کسی کے قریب نہ جانا)

۱۰۔ **تصنع کی ممانعت:**۔ گفتگو میں بعض اوقات فخر یہ باتیں اور شہرت کی خاطر یا بعض اوقات محض تفریح اور تفنن طبع کے لیے لوگ زبانیں پُرتکلف اور چبا چبا کر باتیں کرتے ہیں۔ اسلام نے گفتگو میں اس تصنع و بناوٹ کی بھی ممانعت کی ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو توڑ مروڑ کر بات کرتا ہے۔ جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مروڑ کے گھاس کو کھاتا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ "جو شخص اسلوب کلام میں اس لئے ادل بدل کرتا ہے کہ اس سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالے۔ خدا تعالیٰ قیامت کے روز اس کا فدیہ و توبہ قبول نہ کرے گا۔"

**۱۱۔ تمسخر، طنز، تجسس اور غیبت کی ممانعت:۔** قرآن حکیم نے گفتگو میں دوسرے کی ہنسی اڑانے، طنز کرنے، دوسرے کو کرید نے اور کسی کی غیبت کرنے سے بھی منع فرمایا ہے کیونکہ ان باتوں سے دل شکنی ہوتی ہے اور رنجش پیدا ہو کر اخوت اسلامی کا رشتہ منقطع ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ ............ (اے ایمان والو! لوگ، لوگوں سے تمسخر نہ کریں ............

...... وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (الحجرات: ۱۱) اور اپنے آدمیوں پر طنز نہ کرو اور نہ بُرے القاب سے بدنام کرو)

اگلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ (الحجرات: ۱۲) (اور تجسس نہ کرو اور تم میں سے بعض بعض کی غیبت نہ کریں۔ کیا تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے حالانکہ تم اسے ناگوار جانتے ہو۔)

**(۱۲) عورتوں کا کلام:۔** عورتوں کو بلا ضرورت نامحرم مردوں سے گفتگو نہ کرنی چاہئیے۔ لیکن جب ضرورت پڑے تو بات اور لہجہ میں ایسی نزاکت اور لوچ نہ پیدا کی جائے کہ سننے والے کے دل میں بدی کا خیال پیدا ہو چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (الاحزاب) (اے نبیؐ کی بی بیو! دبی زبان سے بات نہ کرو ایسا کرو گی تو جس کے دل میں کسی بات کا کھوٹ ہے وہ غدا جائے

تم سے کس طرح کی توقع رکھیں گے۔

اور معقول و بے لاگ بات کرنا

**فوائد و ثمرات** آداب گفتگو کو مدِ نظر رکھنے کے بے شمار فوائد و ثمرات ہیں۔ اس سے انسان کے وقار میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ مہذب و متمدن سمجھا جاتا ہے۔ اچھی گفتگو دوسروں کے لیے از خود اپنے لیے بھی فائدہ مند ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی ایسے شخص کو پسند کرتا ہے اور اپنے انعامات سے نوازتا ہے۔

## ۳۔ آداب شرب و طعام

**مفہوم** شرب کے معنی ہیں پینا اور طعام کے معنی ہیں کھانا۔ آداب شرب و طعام سے مراد کھانے پینے کے طور طریقے اور اصول ہیں۔

**اہمیت و ضرورت** کھانا پینا انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اور انسانی زندگی کا انحصار اسی پر ہے۔ لیکن کھانا پینا زندگی کو قائم رکھنے کا ایک وسیلہ ہے، مقصود بالذات نہیں۔ طبی نقطہ نظر سے بھی یہ ضروری ہے کہ کھانا پینا صاف ستھرا اور مفید صحت ہو۔ نیز انسان بسیار خوری کا مرتکب نہ ہو۔ اخلاقی نقطہ نگاہ اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان کھانا کھانے سے پیشتر اپنے آس پاس لوگوں کا بھی خیال کرے کہ کہیں وہ بھوکے تو نہیں۔ انہی مقاصد کی بنا پر کھانے پینے کے آداب و اصول متعین کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

**آداب** اسلام نے شرب و طعام کے مندرجہ ذیل آداب مقرر کیے ہیں :-

**۱- پاکیزگی :-** کھانے پینے کے باب میں اسلام کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اشیائے خورد و نوش کو پاکیزہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے پاکیزہ چیزیں انسان کے لیے حلال اور ناپاک چیزیں حرام قرار دی ہیں جیسا کہ فرمایا :-

اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ (المائدہ) (تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے حلال کردی گئیں)

ایک دوسری جگہ فرمایا :-

وَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَیِّبًا۔ (المائدہ) (اور خدا نے تم کو جو حلال اور پاکیزہ رزق دیا ہے اسے کھاؤ)

پاکیزگی ظاہری و باطنی دونوں لحاظ سے ضروری ہے یعنی جو چیز کھائی جائے وہ شریعت کی رو سے حلال ہونا چاہیے۔ شریعت نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے مثلاً مردار، خون، سؤر۔ غیر اللہ کے نام ذبیحہ، شراب وغیرہ قطعاً نہ کھانا پینا چاہئیں۔ اسی طرح حلال اشیاء جو حرام ذرائع سے حاصل کی گئی ہوں۔ مثلاً سود اور رشوت وغیرہ کی کمائی ہرگز پاکیزہ نہیں۔

**۲- صفائی :-** اس سلسلے میں دوسرا ادب یہ ہے کہ کھانے پینے کی اشیاء صاف ستھری ہونی چاہئیں۔ گندی اور نجس اشیاء نہ صرف مضر صحت ہیں بلکہ شریعت کی نگاہ میں بھی پسندیدہ نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اَلنَّظَافَۃُ مِنَ الْاِیْمَانِ۔ (صفائی جزو ایمان ہے) کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھو لینا چاہیے۔

نیز برتنوں کی صفائی کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کھانے پینے کے برتنوں کو ڈھانپ کر رکھو۔ اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ صفائی رہے اور کوئی بھی چیز یا کیڑا مکوڑا اندر نہ جا سکے۔ صفائی کے پیش نظر ہی حدیث میں آیا ہے کہ کھانے میں صرف تین انگلیوں سے کام لینا چاہیئے۔

**۳۔ سادگی:۔** کھانے کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ خوراک سادہ ہونا چاہیئے اس میں اسراف یا فضول خرچی کا عنصر نہ ہونا چاہیئے۔ قرآن پاک نے کھانے پینے میں اسراف کرنے سے منع فرمایا ہے کہ

| | |
|---|---|
| كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ۔ | (کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا) |

بہت پیٹے اور ایک وقت میں کئی طرح کے کھانے نہ ہونے چاہئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک وقت میں ایک ہی سالن سے روٹی کھاتے تھے۔ سادگی کی حد یہ تھی کہ ایک مرتبہ گھر والوں سے پوچھا کہ گھر میں کوئی سالن ہے؟ جواب ملا کہ سرکہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ فرمایا سرکہ بہترین سالن ہے۔

اس ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ گنجائش سے زیادہ پیٹ بھر کر نہ کھانا چاہیئے۔ شکم سیری یا بسیار خوری نہ صرف آدمی کو سست کر دیتی ہے اور اسے طرح طرح کے امراض میں مبتلا کر دیتی ہے بلکہ احادیث میں بھی اس کی مخالفت آئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو کا کھانا تین کو اور تین کا چار کو کافی ہوتا ہے۔ ایک دوسری

حدیث میں فرمایا کہ ایک کا کھانا دو کو ، دو کا چار کو اور چار کا آٹھ کو کافی رہتا ہے۔

**۴۔ اللہ کا نام لینا:** ۔ کھانے پینے کے اول آخر اللہ کا نام لینا مسنون ہے۔ ابتدا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا چاہیئے اور اگر شروع میں بھول جائے تو درمیان میں جیسے ہی یاد آئے بِسْمِ اللّٰہِ اَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ پڑھ لینا چاہیئے۔ اس ضمن میں ایک حدیث میں بیان ہوا ہے صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ تو جب تک آپؐ کھانا شروع نہ کرتے ہم کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ لیکن ایک مرتبہ ایک بدو بھاگتا ہوا آیا اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ آپؐ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا
پھر اسی طرح ایک لونڈی آئی اور اس نے بھی کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا آپؐ نے اس کا بھی ہاتھ پکڑ لیا اور پھر فرمایا کہ جس کھانے پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا شیطان اس کو اپنے لیے جائز کر لیتا ہے۔
کھانے کے اختتام پر بھی اللہ کی شکر گزاری کے طور پر کوئی دعا پڑھنی چاہیئے۔ احادیث میں متعدد دعائیں منقول ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔

(اور خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور مسلمان بنایا)

۵۔ دائیں ہاتھ سے کھانا:۔ دائیں ہاتھ میں نسبتاً زیادہ چستی اور طاقت ہوتی ہے۔ اس لئے انسان فطرتاً سب کام دائیں ہاتھ سے کرتا ہے۔ اسی ہاتھ کو زیادہ صاف ستھرا بھی رکھتا ہے، لہذا کھانے پینے کے لئے داہنا ہاتھ ہی استعمال کرنا چاہیئے۔ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کل بیمینک (دائیں ہاتھ سے کھاؤ) ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ بائیں ہاتھ سے کھانا شیطان کا کام ہے۔

شریعت نے نہ صرف دائیں سے کھانے بلکہ کھانا پیش کرنے میں بھی دائیں جانب کا لحاظ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ ایک مرتبہ حضورؐ کی خدمت میں دودھ پیش کیا گیا۔ اس وقت آپ کی داہنی جانب ایک بدو بیٹھا تھا اور بائیں جانب حضرت ابوبکرؓ تھے آپ نے دودھ پی کر بدو کی طرف پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ ترتیب میں داہنی جانب کا لحاظ ضروری ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپؐ کی جانب ایک لڑکا اور بائیں جانب کچھ معمر لوگ بیٹھے تھے۔ آپؐ نے کوئی چیز پی تو لڑکے سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو یہ میں ان بزرگوں کو دے دوں۔ اس نے عرض کیا حضورؐ کی عنایت سے جو چیز ملے میں اسے کسی کو نہیں دے سکتا۔ حضورؐ نے پیالہ اسی کی طرف بڑھا دیا۔

۶۔ قریب سے کھانا: کھانا ہمیشہ سامنے اور قریب سے کھانا چاہیئے۔ دور پڑی چیز اٹھانے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا کل مما یلیک (اپنے قریب سے کھاؤ) اس سے ایثار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

اسی ضمن میں یہ بھی ہے کہ کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہیئے اور درمیان سے شروع نہ کرنا چاہیئے۔ اس سے ایک تو کھانے کی جو مقدار بچے گی وہ صاف ہوگی اور دوسرے برتن بھی گندہ نہ ہوگا۔ آنحضرتؐ نے اسے برکت سے تعبیر کیا ہے چنانچہ فرمایا کہ برکت کھانے کے درمیان میں نازل ہوتی ہے۔ گویا درمیان سے کھانے سے برکت جاتی رہتی ہے۔

۷۔ باہم مل کر کھانا:۔ باہم مل کر رہنا سہنا، کھانا پینا اور دوسرے کام انجام دینا حسن معاشرت کا تقاضا ہے۔ اسی لئے آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ افراد خانہ یا دوست و احباب باہم مل کر کھائیں۔

اگرچہ قرآن پاک کی رو سے الگ الگ اور باہم مل کر دونوں طرح کھانا جائز ہے۔ لیکن آنحضرتؐ نے باہم مل کر کھانے کو زیادہ پسند فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ ایک ساتھ مل کر کھانے میں برکت ہوتی ہے۔ باہم مل کر کھانے سے کھانا ضائع بھی نہیں ہوتا اور کھانا کھلانے میں سہولت بھی رہتی ہے۔ آپس میں ایک دوسرے سے محبت بھی بڑھتی ہے اور برکت بھی ہوتی ہے ایک مرتبہ صحابہؓ نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں لیکن سیر نہیں ہوتے فرمایا شاید تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا ایک ساتھ مل کر کھاؤ اور بسم اللہ پڑھ لیا کرو تو برکت ہوگی

۸۔ حصے سے کھانا:۔ اگر ایک سے زائد آدمی شریک طعام ہوں اور کھانا زیادہ نہ ہو تو کسی آدمی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ دو دو لقمے اٹھائے اور دوسروں سے بڑھنے کی کوشش کیونکہ اخلاقی اعتبار سے یہ ایثار کے منافی ہے اور حرص و لالچ پر دلالت کرتا ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دو کھجوریں ملا کر مت کھاؤ ہاں ساتھی اجازت دے تو اور بات ہے۔ مطلب یہ ہے اگر کسی کو زیادہ بھوک ہو تو اسے دوسرے شریک طعام افراد سے زیادہ کھانے کے لئے پوچھ لینا چاہیئے۔

۹۔ پینے کے خصوصی آداب:۔ پینے سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض خصوصی احکام بھی ارشاد فرمائے ہیں۔ آپ نے مشکیزے یا کسی برتن سے براہ راست منہ لگا کر پینے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس سے پانی کی مقدار کا صحیح اندازہ نہیں

پیتا۔ آپؐ نے ایک سانس میں پینے سے بھی منع فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر دو تین سانس میں پینا چاہیئے۔ اس سے طبیعت سیراب ہوتی ہے۔ اسی طرح آپؐ نے فرمایا ہے کہ پانی میں سانس نہ لینا چاہیئے کیونکہ یہ مکروہ ہے۔

**فوائد ثمرات** | آداب شرب و طعام کو ملحوظ رکھنے سے انسان متمدن و مہذب بنتا ہے۔ حلال و حرام کی تمیز سیکھتا ہے۔ خدا اور رسولؐ کے ارشادات کے مطابق کھاتا پیتا ہے۔ اسی طرح جسمانی طور پر بھی تندرست مند رہتا ہے اور خدا کی رضا و خوشنودی حاصل کر کے آخرت میں بھی کامیاب و کامران ہوتا ہے۔

## ۴۔ آدابِ لباس

**مفہوم** | جسم کو ڈھانپنے اور اسے زینت دینے کے طور طریقوں کو آداب لباس کہتے ہیں۔

**ضرورت و اہمیت** | لباس انسانی فطرت کا اہم مطالبہ اور انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے: قدرت نے انسان کے جسم پر دیگر حیوانات کی طرح کوئی پوشش پیدائشی طور پر نہیں رکھی جو اس کی ستر پوشی کرے۔ اور اس کے جسم کی حفاظت کا باعث ہو بلکہ قدرت نے شرم و حیا کا مادہ انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے تاکہ وہ اعضائے صنفی نہیں بلکہ قابل شرم سمجھے اور اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے قدرت کے پیدا کردہ سامان سے اپنے لئے لباس فراہم کرکے جسم کی حفاظت، ستر پوشی اور زینت کا اہتمام کرے۔ اسلام نے انسانی فطرت کے اس مطالبے کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِىْ — اے بنی آدم! ہم نے تم پر ایسا لباس

سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ نازل کیا ہے۔ جو تمہاری شرم گاہ چھپاتا ہے اور زیبائش بھی ہے
اور پرہیزگاری کا لباس سب سے بہتر ہے۔

اس آیت کریمہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ لباس کا فطرت نے انسان پر الہام کیا۔ چنانچہ حضرت آدمؑ و حواؑ کو جب روئے زمین پہ اتارا گیا تو انھوں نے جس چیز کی سب سے زیادہ احتیاج ظاہر کی وہ لباس ہی تھا۔ انھوں نے اسی ضرورت کے تحت اپنے جسم کو پتوں سے ڈھانپا اور پھر آدمؑ نے کپڑا بنانا سیکھا۔ اس طرح لباس معرض وجود میں آیا۔

**آداب** اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کس وضع کا لباس جائز قرار دیتا ہے؟ اور کس طرح کے لباس کی تائید و تاکید کرتا ہے۔ دراصل اسلام میں کسی خاص طرز کے لباس کا حکم نہیں بلکہ اسلام جو دین فطرت ہے زندگی کے دیگر احکام کی طرح اس بارے میں بھی چند بنیادی باتوں پر زور دیتا ہے تاکہ اس کے پیروکار اپنے اپنے علاقوں میں مخصوص آب و ہوا، موسمی ضروریات اور قومی تقاضوں کے مطابق لباس کی کوئی سی صورت بھی اختیار کر لیں بشرطیکہ ان بنیادی اصولوں سے انحراف نہ ہوتا ہو۔

لباس کے بارے میں اسلام کے بنیادی اصول دو طرح کے ہیں۔ مثبت اور منفی۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ **اثباتی پابندیاں**۔ وہ باتیں جنھیں اپنانے کا حکم دیا گیا ہے۔

۱۔ <u>ستر پوشی</u>: ستر سے مراد جسم کا وہ حصہ ہے جسے شریعت نے پوشیدہ

رکھنے کا تقاضا کیا ہے۔ مرد کے ستر کی حدود ناف سے گھٹنے تک ہیں اور عورت کا سارا جسم سوائے چہرے اور ہاتھ پاؤں کے ستر میں شامل ہے۔ ستر کا نمایاں رکھنا جائز ہے اور نہ ہی دوسرے کے ستر کو دیکھنا ہی جائز ہے چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی مرد کسی مرد کے ستر کو نہ دیکھے۔ اور کوئی عورت کسی عورت کے ستر کو نہ دیکھے۔

ستر پوشی کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی ایسا لباس نہ پہنا جائے جس سے ستر دکھائی دیتا ہو یعنی لباس اتنے باریک کپڑے سے نہ تیار کیا گیا ہو۔ جو نیم عریانی کا باعث ہو نیز اتنا چست بھی نہ ہونا چاہیئے۔ جس سے جسم کے مختلف حصوں کی بناوٹ نمایاں ہوتی ہو یعنی چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے وغیرہ میں اعضاء کی بناوٹ ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ حضور نے فرمایا کہ وہ عورتیں جو کپڑوں میں بھی عریاں رہیں، غیر مردوں کی طرف مائل ہوں اور انہیں دعوت میلان دیتی ہیں وہ جنت میں داخل نہ ہوں گی اور نہ اس کی بو پائیں گی۔ حالانکہ جنت کی خوشبو پانچ سو برس کی مسافت سے آ جائے گی۔ درحقیقت آنحضور نے اس حدیث میں اس امر کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ ایک مرتبہ حضرت اسماءؓ باریک کپڑے پہن کر حضور کے سامنے آئیں تو آپ نے منہ پھیر لیا اور فرمایا اسے اسماء جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے بدن کا کوئی حصہ دکھائی نہ دینا چاہیئے۔ سوائے منہ اور ہتھیلیوں کے ہے کہ نیم برہنہ کی عورت کی حیثیت کو اور نمایاں کرتی ہے اور اس سے پوشش کا حق ادا نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ آنحضور کی خدمت میں چند قبطی کپڑے لائے گئے۔ آپ نے ان میں سے ایک کپڑا ایک صحابی کو دیا اور فرمایا کہ اس کے دو ٹکڑے کر لو ایک کی قمیص بنوا لو اور ایک اپنی بیوی کو دے دینا وہ اوڑھنی بنا لے گی۔ جب وہ چلے،

تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اپنی بیوی سے کہہ دینا کہ اس کے نیچے کوئی دوسرا کپڑا لگا لے تاکہ بدن نہ جھلکے۔

۳۔ حفاظتِ جسم:۔ اسلامی لباس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جسم کی حفاظت کا موجب ہو یعنی گرمی، سردی اور دیگر موسمی اثرات سے محفوظ رکھے اور بوقتِ جنگ دشمن سے حفاظت کرتا ہو۔ اسی لئے لباس موسمی اور دیگر ضروریات کے مطابق ہونا چاہیئے۔ آنحضورؐ کا ارشاد ہے کہ عمدہ لباس پہننے والا گھوڑے پر چڑھنے کی مانند ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ آرام میں رہتا ہے اور بہت سی ایذاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔

۴۔ زینت:۔ اسلامی لباس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے یعنی زینت یا آرائش ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (ہر نماز کے وقت زینت سے رہو)

نماز کا حکم دن میں پانچ مرتبہ کا ہے اس لئے سارا دن ہی زینت سے رہنا ضروری ہو جاتا ہے۔

زینت کا مطلب زرق برق ہونا نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ لباس صاف ستھرا خوشنما اور پہننے والے کی شایانِ شان ہو۔ چنانچہ ایک طرف وہ لباس جس سے انسان کی بے دمی ہو اور اس کی تذلیل ہوتی ہو زینت کے شرعی مفہوم کے منافی ہے تو دوسری طرف ایسا لباس جس سے ترہ آسائی ہو اور غرور و تکبر کی جھلک نظر آئے ممنوع ہے۔

درحقیقت خدا تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اس کی نعمتوں کی علامات اسی کے بندوں سے ظاہر ہوں۔ چنانچہ آنحضورؐ کی خدمت میں ایک شخص پھٹے پرانے لباس حاضر ہوا۔ آپ نے پوچھا کیا تمہارے پاس مال ہے؟ اس نے جواب دیا۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے اونٹ گھوڑے بکریاں اور غلام دیئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا جب اللہ نے تجھے مال دیا ہے تو اس کے اثرات تجھ پر نظر آنے چاہئیں۔ مراد یہ ہے کہ حسب حیثیت لباس پہننا چاہیئے۔

آنحضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ تم اپنے بھائیوں کے پاس جا رہے ہو تو اپنا سامان سفر اور پوشاک درست کر لو تاکہ تم معزز نظر آؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو فحش و تفحش یعنی بد ذوقی ناپسند ہے۔

حضور اکرمؐ نے ایک جوتا پہننے سے منع فرمایا کیونکہ یہ بدزیبی ہے آپؐ نے فرمایا کہ یا تم دونوں جوتے پہنو یا دونوں اتار دو۔

**صفائی و پاکیزگی**:۔ لباس کی صفائی و پاکیزگی کا قرآن حکیم میں باقاعدہ حکم دیا گیا ہے۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (اور اپنے کپڑوں کو خوب پاک و صاف رکھو اور نجاست سے دور رکھو)

لباس کی پاکیزگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بغیر اسلام کا نماز جیسا اہم رکن بھی ادا نہیں ہو سکتا۔

آنحضورؐ نے طہارت کو نصف ایمان قرار دیا ہے۔ طہارت یعنی ظاہری صفائی اور باطنی پاکیزگی لباس کے معاملہ میں اشد ضروری ہے۔ چنانچہ ارشاد نبویؐ ہے سفید کپڑے پہنو کہ وہ زیادہ پاک اور ستھرے ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا سب میں اچھے کپڑے جنہیں پہن کر تم خدا کی زیارت قبروں میں اور مسجدوں میں کرو سفید کپڑے ہیں۔

ایک مرتبہ حضورؐ نے ایک شخص کو پراگندہ سر دیکھا جس کے بال بکھرے ہوئے تھے تو فرمایا کیا اس کو ایسی چیز نہیں ملتی جس سے بالوں کو اکٹھا کر دے۔ اور ایک

دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا کیا اس کو ایسی چیز نہیں ملتی جس سے
کپڑے دھو لے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہؐ کے لیے سیاہ چادر تیار کی گئی آپؐ نے
اس کو استعمال کیا جب پسینہ آیا اور اس کی بو پھیلی تو اس کو اتار دیا۔

صفائی و پاکیزگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے آنحضورؐ نے ریشم کا پہننا
مردوں کے لئے حرام ہے اس کے پہننے کی حضرت زبیرؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف
کو صرف اس لیے اجازت مرحمت فرما دی کہ انہوں نے جوؤں کی شکایت کی۔ نیز آپؐ
نے درندوں کی کھال بچھانے سے بھی منع فرمایا۔

۵۔ سادگی :۔ لباس میں تکلف و بے جا آرائش مردوں کے شایان شان نہیں
حضورؐ پوشاک میں تکلف نہیں فرماتے تھے آپؐ کا عام لباس قمیص اور چادر
ہوتا تھا۔ وفات کے وقت آپؐ کا لباس فقط ایک پیوند شدہ بھدی چادر اور
ایک موٹا تہمد تھا۔ جوتے سیدھے سادے آج کل کے چپل کی طرح ہوتے تھے جن پر چمڑے
کا تسمہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوتی تھی۔

یہی سادگی ازواج امہات المومنین کی زندگی پر بھی چھائی ہوئی تھی اور عامۃ المسلمین
بھی اسی رنگ میں اصحاب صفہ کا لباس ایک ہی بڑا کپڑا جسے گردن میں باندھ کر
نیچے سے لپیٹ لیتے تھے کبھی آدھی پنڈلی اور کبھی ٹخنوں تک لٹکا رہتا تھا
اسے ہاتھ سے سنبھالتے رہتے تھے کہ ستر نہ کھلے۔

روایت۔ حضرت عائشہؓ نے پیوند لگی ہوئی کملی اور موٹا تہمد نکالا اور کہا
کہ حضورؐ کی وفات انہی میں ہوئی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کپڑے کو پرانا نہ سمجھو جب
پیوند نہ لگا لو۔ ایک دوسری روایت میں فرمایا سادگی ہونا ایمان سے ہے
سادگی ہونا ایمان سے ہے۔

## ا۔ سلبی پابندیاں:- جن سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے

۷۔ اسراف نہ ہو: اسراف یعنی فضول خرچی کو اسلام نے زندگی کے ہر پہلو میں ناپسند کیا ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو قرآن پاک نے اخوان الشیاطین قرار دیا ہے چنانچہ لباس میں بھی آنحضورؐ نے اسراف کی ممانعت فرمائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جو چاہے کھا اور جو چاہے پہن جب تک دو باتیں نہ ہوں اسراف اور تکبر۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے لباس فقط ضرورت بھر ہونا چاہیئے اور جہاں تک ممکن ہو فالتو لباس سے احتراز کیا جانا چاہیئے کیونکہ یہ اسراف ہے۔ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے مقدرت کے باوجود محض تواضع کے خیال سے کوئی فالتو لباس چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے سب لوگوں کے سامنے بلا کر اختیار دے گا کہ ایمان کا جو لباس چاہے انتخاب کر لے۔

آنحضورؐ نے فرمایا کہ ایک بچھونا مرد کے لئے اور ایک اس کی زوجہ کے لئے اور تیسرا مہمان کے لئے اور چوتھا شیطان کے لئے یعنی گھر کے افراد اور مہمانوں کے لئے بچھونے رکھنا جائز ہے اور ضرورت سے زیادہ رکھنا درست نہیں۔

۸۔ شہرت و تکبر نہ ہو:۔ غرور و تکبر اور تکلف و تصنع سے بھی اسلام سختی سے روکتا ہے اور آنحضورؐ نے لباس میں ان کی خصوصیت سے ممانعت فرمائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ کھاؤ پیو اور صدقہ کرو اور پہنو جب تک اسراف و تکبر کی آمیزش نہ ہو۔

اسلام سے قبل عربوں میں دستور تھا کہ امراء اپنی شان دکھانے کے لئے تہمد کو اتنا لمبا رکھتے تھے کہ زمین پر گھسٹتا چلا جاتا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت کی اور فرمایا کہ جو شخص تکبر کے طور پر تہمد گھسیٹے گا اللہ تعالیٰ اس پر نظر رحمت نہیں فرمائے گا۔ ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ ایک

شخص اترانے کے طور پر تہبند گھسیٹ رہا تھا۔ وہ زمین میں دھنسا دیا گیا ہے جب وہ قیامت تک زمین میں دھنستا ہی چلا جائے گا۔

لباس اپنی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ جو نہ نہایت اعلیٰ ہو اور نہ ہی بہت ادنیٰ۔ کیونکہ اعلیٰ کپڑے سے بھی نمود و نمائش ہوتی ہے اور گھٹیا لباس بھی نمائش کا موجب بنتا ہے۔ لوگوں کی نظریں رہتی ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شاید یہ کوئی صاحب کمال درویش تارک الدنیا شخص ہے۔ اسی لیے آنحضورؐ نے لباس شہرت کی ممانعت فرمائی ہے یعنی تکبر کے طور پر اچھے کپڑے پہننا مثلاً جو شخص عالم تو نہ ہو مگر علماء کے سے کپڑے پہن کر لوگوں کو اپنا عالم ہونا جتلائے۔ یا جو درویش تو نہ ہو مگر ایسے کپڑے پہنے۔ جس سے لوگ اسے درویش سمجھیں۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص شہرت کا کپڑا پہنے گا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو ذلت کا کپڑا پہنائے گا۔ اتنا لباس جس سے ستر ہو جائے اور حفاظت جسم کا موجب ہو فرض ہے اور اس سے زائد جس سے زینت مقصود ہو اور اللہ کی نعمت کا اظہار ہوتا ہو مستحب ہے۔ لیکن اس قسم کا لباس پہننا کہ انسان میں غرور و تکبر پیدا ہو ممنوع ہے۔ ایسے لباس جس کے پہننے سے اپنی اصلی حالت میں تغیر محسوس ہو اور انسان دوسروں کو جو کے پاس ویسا لباس نہ ہو بے نظر حقارت دیکھنے لگے تکبر کی علامت ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ لباس فاخرہ ترک ایمان کا حصہ ہے

۳۔ اہل تشبیہ نہ ہو۔ اسلام نے اگرچہ کسی خاص وضع کے لباس کا حکم نہیں دیا لیکن یہ ضرور ہے کہ لباس میں عادات و اطوار کی طرح کسی غیر قوم کا تشبہ جائز نہیں۔ چنانچہ آنحضورؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص جس قوم سے تشبہ کرے وہ انہی میں سے ہے۔ من تشبہ بقوم فھو منھم۔ لباس میں کفار اور فساق و فجار سے مشابہت بدعتی ہے اور اہل اصلاح و تقویٰ سے مشابہت اچھی

ہے۔ اسلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو کفار اور فساق و فجار سے اس طرح ممتاز رکھے کہ پہچانا جا سکے اور بہ حیثیت مجموعی ان کے لباس سے غیر مسلم ہونے کا اس پر شبہ نہ ہو سکے۔ پیش نظر حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکریوں کو یہ فرمان بھیجا تھا کہ عجمیوں کے بھیس سے بچو ان جیسی وضع قطع نہ بنا لینا۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضور نے مجھے کسم کے رنگے ہوئے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا یہ کافروں کے کپڑے ہیں انہیں مت پہنو۔ میں نے کہا انہیں دھو ڈالوں فرمایا جلا دو۔

اسلام میں اسی طرح مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا تشبہ کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ آنحضور کا ارشاد ہے کہ جو مرد عورتوں کا اور جو عورتیں مردوں کا تشبہ کریں ان پر لعنت ہے۔ اسی بنا پر سونا اور ریشم جو عورتوں کی آرائش ہیں۔ مردوں کے لئے ممنوع ہیں اور عورتوں کے لئے جائز ہیں۔ آنحضور نے فرمایا کہ سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لئے حلال ہے اور مردوں پر حرام ہے حضور اکرم نے ایک شخص کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی۔ آپ نے اتار کر پھینک دی اور اسے انگارے سے تشبیہ دی۔ اسی طرح آپ نے ریشمی لباس کے بارے میں فرمایا کہ جو شخص دنیا میں ریشم پہنے گا۔ اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ البتہ حضور اکرم نے چار انگل ریشم پہننے کی مرد کو اجازت دی ہے۔

ان تمام باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے جو لباس مقرر کیا ہے وہ دراصل تقویٰ کا لباس ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے "وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ" اور تقویٰ کا یہ لباس ہی بہتر ہے، اس لئے اسلام نے یہ بھی تقاضا کیا ہے، کہ ظاہر کی اصلاح باطن کی اصلاح پر مقدم نہ ہونی چاہیے اور پھر باطن کی اصلاح بھی

تبدیلی کے مطابق ظاہر کی تبدیلی بھی کرتے چلے جانا چاہیئے۔ ورنہ محض اپنے کو ظاہراً ایک متقی انسان کے نقشہ پر ڈھال لینا اور دل میں تقویٰ پیدا نہ ہو اسی طرح ہوگا جیسے تانبے کے سکے پر سونے کا ملمع کر دیا جائے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق تبلیغ پر غور کیا جائے تو اس سے بھی یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے۔ کہ آپؐ نے پہلے اپنی پوری توجہ تزکیۂ نفوس اور مسلمانوں کی باطنی اصلاح اور ان میں تقویٰ کی صفات پیدا کرنے میں صرف کی اور پھر پندرہ سولہ برس بعد جبکہ ان کا باطن درست ہوگیا آپؐ نے ظواہر کے متعلق ہدایات جاری کیں۔ چنانچہ لباس وغیرہ کے بارے میں آپؐ کے ساری احادیث مدنی زندگی کے آخری پانچ چھ برسوں کی ہیں۔

**فوائد و ثمرات** لباس کے بارے میں اسلام نے جو احکامات دیئے ہیں ان کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان ایسی وضع قطع اختیار کرے جسے دیکھ کر ہر شخص اندازہ کر سکے کہ اس وضع کا حامل حقیقی مسلمان ہے اور اس کے لباس سے تقویٰ کا اظہار ہوتا ہو۔ اس سے انسان نہ صرف اسلام کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔ بلکہ اللہ کی رضا و خوشنودی بھی حاصل کر لیتا ہے۔

## ۵۔ آداب مجلس

**مفہوم** مجلس بمعنی بیٹھنا اور مجلس بیٹھنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں دو یا دو سے زیادہ افراد باہم بیٹھنے سے مجلس قائم ہوتی ہے۔ مجلس میں اٹھنے بیٹھنے کے بعض اصول ہیں۔ جنہیں آداب مجلس کہتے ہیں۔

**اہمیت و ضرورت** مجلس ایک تمدنی اور معاشرتی تقاضا ہے۔ جہاں

انسان ایک معاشرے کی صورت میں رہتے ہیں، باہمی معاملات کے لئے مجلس ضرور قائم ہوتی ہے۔ ایک اچھی مجلس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اس میں تہذیب و شائستگی پیدا ہو۔ اور ہر شریک مجلس کا حق پورا پورا ادا ہو اور مجلس باہمی انبساط پیدا کرنے کا سبب ہو۔ انہی مقاصد کے لئے شریعت نے مجلس کے آداب مقرر کئے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس گاہ عموماً مسجد ہوتی تھی۔ خلافت راشدہ میں بھی مجالس مسجدوں میں منعقد ہوتی تھیں بلکہ آج تک یہی دستور چلا آتا ہے کہ اسلامی تقریبات کے انعقاد اور ملت اسلامیہ کے اجتماعی امور پہ غور و خوض کے لئے مساجد میں ہی مجالس قائم ہوتی ہیں۔ اسی لئے اسلام میں مجلسی زندگی کی اولین تربیت گاہ مسجد ہے اور اسلامی آداب مجلس، آداب مسجد سے ہی اخذ ہوتے ہیں۔

## آداب

قرآن و سنت کی روشنی میں مجلس کے مندرجہ ذیل ضروری آداب سامنے آتے ہیں۔

۱۔ **شمولیت** :۔ مجلس میں سب سے پہلے آنے والے کو سب سے آگے بیٹھنا چاہیئے اور بعد میں آنے والے کو جہاں جگہ مل جائے وہیں بیٹھ جانا چاہیئے۔ آگے جگہ خالی چھوڑ کر پیچھے نہ بیٹھنا چاہیئے اور نہ ہی بعد میں آنے والے کو مجمع چیر کر یا کندھوں پر سے گذر کر آگے جانا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے پہلے بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسے کرنے والے کے ذہن میں غرور پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں جمعہ کے سلسلے میں دوسروں کی گردنوں کو روند کر آگے بڑھنے کو خصوصاً منع کیا گیا ہے۔ اسلام دراصل مجلس میں مساوات قائم کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

۲۔ **بیٹھنے کا حق** :۔ مجلس میں جو شخص جس جگہ بیٹھ جائے وہی اس کا حق ہے

لہذا اگر وہ کسی ضرورت سے اٹھ کر جائے تو واپس آنے کے بعد وہی اس جگہ کا حقدار ہوگا۔ کسی دوسرے کو وہاں نہ بیٹھنا چاہیئے۔

اسی طرح مجلس میں کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ بیٹھنا بھی درست نہیں کیونکہ اس طرح دوسرے کے دل میں کدورت پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ بیٹھنے کے اصول :۔ مجلس میں اس طرح نہ بیٹھنا چاہیئے کہ ہر مجلس اور دوسروں کے درمیان حائل ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کچھ لوگ مجلس میں حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوں تو کسی کو اس حلقہ کے وسط میں نہ بیٹھنا چاہیئے۔ آنحضرتؐ نے ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی ہے۔ کیونکہ اس طرح بعض کی طرف اس کا منہ ہوگا اور بعض کی طرف کمر اور یہ صورت تہذیب کے خلاف ہے۔

اگر کسی مجلس میں دو شخص باہم مل کر بیٹھے ہوں تو ان کے درمیان بیٹھنا درست نہیں کیونکہ اس طرح ان کا الگ الگ کر دینا تکدر کا باعث بنتا ہے۔ مجلس میں جو جگہ معزز ہو وہاں یا اس کے قریب بلا اجازت نہ بیٹھنا چاہیئے۔ مجلس میں کسی کے گرد یا سامنے کھڑا رہنا بھی ٹھیک نہیں۔ یہ عجمیوں کی عادت تھی۔

۴۔ کشادگی :۔ مجلس میں اس طرح بیٹھنا چاہیئے کہ بعد میں آنے والوں کے لئے جگہ باقی رہے اور اگر آدمی زیادہ آ جائیں اور جگہ کم ہو تو گنجائش پیدا کر لینی چاہیئے۔ مثلاً اگر صفوں کی صورت میں بیٹھے ہوں تو تنگ تنگ ہو جانا چاہیئے اور اگر حلقے کی شکل میں بیٹھے ہوں تو کھل جانا چاہیئے تاکہ جگہ پیدا ہو جائے۔ قرآن حکیم میں اس کی یوں تلقین کی گئی ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ وَاِذَا قِيْلَ

(اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کشادگی پیدا کرو تو کشادگی کرو۔ اللہ تمہارے لئے کشادگی کرے گا۔)

انشزوا فانشزوا (المجادلہ) (اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ)

۵۔ نیکوں کی صحبت :۔ انسان پر سب سے زیادہ اثر صحبت کا ہوتا ہے، ہر شخص جس طرح کے ہم نشینوں کو پسند کرتا ہے اس سے اس کے میلان کا پتہ چلتا ہے، اور انہی سے اس کے کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ لہذا انسان کو ہمیشہ نیک اور صالح لوگوں کی مجلس میں بیٹھنا چاہیئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اس لئے ہر شخص کو دیکھ لینا چاہیئے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے پھر فرمایا کہ اچھے ہم نشین اور برے ہم نشین کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی کی ہے۔ مشک بیچنے والے کی صحبت سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور حاصل ہوگا یا اس کو خریدو گے یا کم از کم اس کی خوشبو سونگھتے رہو گے۔ مگر لوہار کی بھٹی سے تمہارا گھر یا کپڑا جل جائے گا یا کم از کم تمہارے دماغ میں اس کی ناگوار بو پہنچے گی۔

۶۔ پاکیزگی و تقدس :۔ مجلس کو پاکیزہ و مقدس رکھنا چاہیئے اور کوئی ایسی بات نہ سرزد ہونی چاہیئے جس سے مجلس کے تقدس کو نقصان پہنچتا ہو۔ اسی کے پیش نظر کسی مجلس میں بدبودار چیز (مثلاً پیاز، لہسن) وہ کھا کر جانے یا وہاں بیٹھ کر کھانے کی ممانعت کی گئی ہے۔

اسی طرح مجالس میں لغو، بیہودہ اور بے مقصد گفتگو کرنا اور شور وغل بھی درست نہیں ایسی گفتگو ہونا چاہیئے۔ جس سے شرکائے مجلس مستفید ہوں۔ ہنسی مذاق بھی اخلاقی حدود کے اندر ہونے چاہیئے۔ بہتر یہ ہے کہ کوئی گھر کوئی مجلس ذکر خدا سے خالی نہیں رہے۔ حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ جو لوگ ایسی مجلس سے اٹھتے ہیں۔ جس میں خدا کا نام نہیں لیا گیا وہ گویا کہ گدھے کی لاش کے سرہانے سے اٹھتے ہیں اور ان کے حصے میں حسرت آتی ہے۔

۷۔ **سرگوشی کی ممانعت**:۔ مجلس میں بیٹھ کر آپس میں کانا پھوسی نہ کرنی چاہیئے اس سے دوسروں کو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ مبادا وہ بات انہی کے بارے میں کہی جارہی ہے۔ یہ طرز عمل منافقین کا ہے۔ قرآن حکیم میں اس کی مذمت بدیں بیان ہوئی ہے۔

اِنَّمَا النَّجْوٰی مِنَ الشَّیْطٰنِ لِیَحْزُنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (المجادلۃ)

(یہ جو کانا پھوسی ہے سو شیطان کا کام ہے کہ ایمان والوں کو دلگیر کرے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا کہ تیسرے آدمی کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں کہ اس سے تیسرا غمگین ہوگا۔

۸۔ **راستہ کی مجلس**:۔ راستے یا کسی گذرگاہ پر مجلس قائم نہ کرنی چاہیئے کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے اور گذرنے والوں کے لئے بھی رکاوٹ کا باعث بنتی ہے۔ البتہ اگر ایسی مجبوری پیش آجائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چند باتوں کی پابندی ضروری ہے۔ یعنی نگاہیں نیچی رکھنا، ضرر رساں چیزوں کو راستہ سے ہٹانا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم دینا، بری باتوں سے منع کرنا، بھولے ہوؤں کو راستہ بتانا اور مصیبت زدوں کی امداد کرنا۔

۹۔ **مجلس کے راز**:۔ آداب مجلس میں سب سے آخری لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر مجلس کے کچھ راز ہوتے ہیں۔ انہیں امانت سمجھنا چاہیئے۔ اور ایک مجلس کے راز دوسری جگہ بیان نہ کرنا چاہئیں کیونکہ اس سے مجلس کا شیرازہ منتشر ہوجائے گا۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ (مجلسیں امانت کے ساتھ ہیں)

**فوائد و ثمرات**

آداب مجلس کو ملحوظ رکھنے سے انسان برے لوگوں اور کئی برائیوں سے بچ جاتا ہے۔ معاشرے میں خوشگوار ماحول پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کی رضا و خوشنودی بھی حاصل ہوتی ہے جو سب سے بڑی دولت ہے۔

باب ۵

# حقوق و فرائض

- ——— والدین و اولاد
- ——— رشتہ دار
- ——— ہمسایہ
- ——— استاد و شاگرد
- ——— شہری

# حقوق و فرائض

**تفہیم:** حقوق وہ مراعات ہیں جو انسان کو دوسروں کی جانب سے حاصل ہوتی ہیں اور فرائض وہ ذمہ داریاں ہیں جو دوسروں کے لیے اس پر لازم آتی ہیں۔ حقوق و فرائض لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کے حقوق دوسرے کے فرائض ہیں۔

**حقوق کی اقسام:** حقوق کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں۔ ایک حقوق اللہ، یعنی وہ ذمہ داریاں جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہم پر لازم آتی ہیں جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ۔ دوسرے حقوق العباد یعنی وہ ذمہ داریاں جو دوسرے انسانوں کے لیے ہم پر عائد ہوتی ہیں جیسے حقوق والدین، حقوق اولاد، حقوق زوجین، حقوق اقارب، حقوق ہمسایہ، حقوق شہری وغیرہ۔

**حقوق العباد کی اہمیت:** اگرچہ تمام حقوق کی ادائیگی انسان پر فرض ہے مگر اسلام میں حقوق العباد کو اس درجہ اہمیت حاصل ہے کہ انہیں حقوق اللہ پر فوقیت دی گئی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ کے حقوق ادا نہیں کرتا تو خدا چاہے تو اسے معاف کر دے مگر جو شخص بندوں کے حقوق ادا نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اسے وقت تک معاف نہیں کرے گا جب تک کہ وہ بندہ اسے معاف نہ کر دے گا۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ انسان حقوق اللہ کو فراموش کر بیٹھے اور حقوق العباد میں ہی لگا رہے بلکہ مراد یہ ہے کہ حقوق العباد کی ادائیگی کے بغیر حقوق اللہ کو ادا کرنا ممکن نہیں۔ حقوق العباد کی ادائیگی ایک فطری تقاضا ہے۔ مثلاً والدین کے اولاد پر بے شمار احسانات ہوتے ہیں۔ پیدائش سے پروان چڑھنے تک پرورش اور تعلیم و تربیت کے تمام مراحل طے کرانے میں والدین طرح طرح کی تکلیفیں اپناتے ، والدین کی اس بے لوث محبت اور بے حد و کنار احسانات

ے بدلہ میں اولاد کی طرف سے ان کے حقوق متعین ہوتے ہیں۔ اس طرح اولاد سے والدین
کے بہت سے مفادات وابستہ ہوتے ہیں مثلاً جذبہ محبت کی تسکین بقائے نسل کی خوشی آئندہ
ندگی میں ان سے خدمت و معاونت کی امید۔ اسی سے حقوق اولاد قائم ہوتے ہیں۔ اسی طرح
ے زوجین رشتہ دار، ہمسایہ، شہری اور دیگر افراد کے معاشرہ کے حقوق مقرر ہوئے ہیں اسلام
نے جو حقوق العباد متعین کیے ہیں وہ زیادہ معقول، منصفانہ اور مکمل ہیں مثلاً اسلام نے حقوق
لعباد کی تقسیم میں بڑوں اور چھوٹوں سب کو مناسب حقوق دلائے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ
سلم نے فرمایا: (مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيرَنَا فَلَيْسَ مِنَّا) (وہ ہم سے نہیں جو
ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کی عزت نہیں کرتا)

اسلام میں حقوق العباد کو اس قدر وسعت حاصل ہے کہ نہ صرف دوسرے تمام
انسانوں بلکہ خود اپنی ذات کے بھی حقوق انسان پر عائد ہوتے ہیں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا کہ فَإِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (بیشک تیری جان کا تجھ پر حق ہے یعنی یہ کہ اس
کی صحت کا خیال رکھا جائے اور اس سے خدا کی رضا و خوشنودی کے کام لیے جائیں)

حق العباد کا یہ دائرہ اتنا وسیع ہے کہ نہ صرف انسانوں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تمام
مخلوقات کے حیوانات، نباتات اور جمادات سب کے انسان پر حقوق ہیں وہ یہ کہ ان کی
قدرتی نشوونما اور ترقی کے لیے مناسب اسباب فراہم کرے اور یہ کہ جس غرض اور منفعت
کے لیے انہیں پیدا کیا گیا ہے ان سے وہی کام لیا جائے اور بے موقع صرف نہ کیا جائے۔

اسلام میں حقوق العباد کی ایک خاص ترتیب بھی مقرر کی ہے اور حقوق کو ہر انسان کے
تعلقات کی کمی بیشی اور دوری و نزدیکی کی تدریج و ترتیب کے لحاظ سے متعین کیا ہے
مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کا ایک اجنبی کے مقابلہ میں ایک دوست کا
اور ایک غیر کے مقابلہ میں اپنے کا حق زیادہ ہے مگر حقوق کی یہ ترتیب حق و انصاف
کے تابع ہے اگر کسی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو تو اس کے مقابلہ میں اس بیگانے کو ترجیح

دی جائے گی، اُس کا حق پہلے ہے۔

حقوق العباد کی ادائیگی کی قرآن و احادیث میں حد درجہ تاکید کی گئی ہے اور عقل، شریعت اور صفائی معاملات کا بھی یہ تقاضا ہے کہ حقوق العباد کی اہمیت کو ملحوظ رکھا جائے اور ان کی تاکید کی ترتیب کے اعتبار سے انہیں ادا کیا جائے۔

فوائد و ثمرات: حقوق العباد کی ادائیگی میں انسان کی دنیوی بہبود اور اخروی نجات مضمر ہے۔

# ۱۔ حقوق والدین

مفہوم: حقوق والدین سے مراد وہ رحمانہ رابطہ ہے جس میں جو والدین کو اولاد کی طرف سے حاصل ہیں یا اس سے مراد وہ ذمہ داریاں ہیں جو اولاد پر والدین کیلئے عائد ہوتی ہیں۔

اہمیت:۔

حقوق والدین کی اہمیت کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ قریب ترین رشتہ: حقوقِ والدین کی اہمیت اسی بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ دنیوی تعلقات میں انسان کا سب سے زیادہ تعلق والدین سے ہوتا ہے اور تمام رشتہ داریوں میں سب سے بلند درجہ والدین کا ہے کیونکہ انسان کی باقی تمام رشتہ داریاں یا تو باپ کے تعلق سے ہوتی ہیں یا پھر ماں کی وساطت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے ہر رشتہ دار کا حق بھی والدین سے نسبت اور قربت کے لحاظ سے متعین کیا جاتا ہے۔ جتنا کوئی قریب کا تعلق رکھتا ہو اسی قدر زیادہ وہ حسن سلوک کا مستحق ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے خود والدین کو سب سے زیادہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

۲۔ والدین کے احسانات: یوں بھی دیکھا جائے تو والدین کے انسان پر اس قدر احسانات ہوتے ہیں کہ انسان ان کی خدمت

میں تمام عمر بھی مصروف کر دے تو حق ادا نہیں کر سکتا۔ اولاد کی پیدائش سے لے کر جوان
پڑھانے لکھانے تک پرورش اور تعلیم و تربیت کے تمام مراحل طے کرانے میں والدین طرح طرح
کی تکلیفیں اٹھاتے اور قسم قسم کے غم برداشت کرتے ہیں۔ ہر انسان کی نیند اور دل کا آرام
بچوں کیلئے قربان کر دیتے ہیں اور ہر قسم کے جانی و مالی ایثار و قربانی کے لیے ہر وقت
آمادہ رہتے ہیں۔ بچپن میں جب انسان کو سہارے کی ضرورت ہوتی ہے تو سہارا دیتے
ہیں۔ کھلاتے پلاتے اور پہناتے ہیں اور اگر بچے کو ذرا سی تکلیف بھی آ جائے تو دور
کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ پھر اولاد کی تعلیم و تربیت میں اپنی خون پسینے کی
کمائی کو انتہائی فراخدلی سے خرچ کرتے ہیں۔ والدین کی بے لوث محبت، احسان کے
جانی و مالی ایثار، احسانات کا بدلہ چکانا ممکن نہیں۔ لہٰذا ان کے لیے جس قدر بھی خدمت
کی جائے بہتر ہے۔

۲۔ کتاب و سنت میں تاکید: حقوق والدین کی اہمیت صرف عقلی دلائل سے مسلّم
ہے بلکہ قرآن حکیم اور احادیث نبوی میں بھی اس کی سخت تاکید موجود ہے۔ قرآن پاک میں
میں متعدد مقامات پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور اکثر جگہ والدین کا ذکر
توحید باری تعالیٰ کے ذکر کے بعد کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

اَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ (لقمٰن) — تو میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کر (لقمٰن)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۱ (بنی اسرائیل)

اور تیرے پروردگار نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کیساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کی عظمت اور ان کے مرتبہ و مقام کو واضح فرمایا
ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ خدا کی خوشی ماں باپ کی خوشی ہے اور خدا کی ناراضگی

ماں باپ کی ناراضگی ہے"۔ آپ نے حقوق والدین کی اس قدر اہمیت بیان فرمائی کہ آپ نے فرمایا" والدین کا حق کبھی نہیں چکایا جا سکتا۔ ہاں ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ اگر وہ کسی کے غلام ہوں تو انہیں خرید کر آزاد کر دے"۔

۴۔ والدہ کا مقام :۔ اسلام نے والدین میں بھی والدہ کا مقام بہت زیادہ بلند قرار دیا ہے اور والدہ کے حقوق والد کی نسبت زیادہ مقرر کیے ہیں۔ کیونکہ اولاد کی پرورش وتربیت کے لیے جن قدر تکالیف والدہ کو پیش آتی ہیں۔ والد کو نہیں آتیں۔ حمل وضع حمل تربیت کے دیگر مراحل کی سخت تکالیف برداشت کرنا فقط والدہ ہی کا حصہ ہے چنانچہ قرآن پاک نے والدہ کی ان عظیم خدمات کا ذکر کیا ہے :۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ (لقمان: ۱۴)

اور ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے۔

آنحضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بیشتر احادیث میں والدہ کے مقام کا بیان فرمایا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے! فرمایا تیری ماں اس نے عرض کیا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، تین بار آپ نے یہی جواب دیا، اور چوتھی مرتبہ ارشاد فرمایا تیرا باپ (بخاری) یعنی اگر حسن سلوک کے چار مواقع ہوں تو تین کی حقدار ماں ہے۔

ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سر فہرست ماں کی نافرمانی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے (بخاری) نیز آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ نیک سلوک اور عمدہ برتاؤ کی سب

زیادہ حقدار ماں ہے۔

# والدین کے حقوق

قرآن وسنت اور تعلیمات اسلام کی روشنی میں والدین کے متعدد [illegible] حقوق ثابت ہوتے ہیں۔

۱۔ **حسن سلوک**:۔ والدین کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا جائے۔ ان کا ادب و احترام کیا جائے اور نہایت محبت و شفقت [illegible] سے گفتگو اور بات چیت نیز اٹھتے بیٹھتے ہر لمحہ ان کی عزت و تکریم کی جائے اور کوئی سخت بات نہ کہی جائے بلکہ اگر وہ کوئی سخت بات کہیں تو اسے خاموشی سے صبر کر کے برداشت کر لیا جائے۔ بالخصوص بڑھاپے میں جب انسان کے مزاج میں چڑچڑاپن آجاتا ہے۔ معمولی معمولی بات پر غصہ آنے لگتا ہے اور عادات بچوں کی طرح ہو جاتی ہیں تو اس وقت ان کے ساتھ نرمی، محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آنا چاہیے اور ان کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

| | |
|---|---|
| وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا | اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش [illegible] |
| يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُ | آؤ۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے |
| هُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ | کو پہنچ جائیں تو انہیں اف تک [illegible] |
| لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَ | اور نہ ان پر خفا ہو اور ان سے بات ادب |
| قُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا | سے کرو اور ان کے لیے اطاعت کا بازو جھکائے |

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ [illegible] (بنی اسرائیل: ۲۳ ۔ ۲۴)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں والدین کے ساتھ [illegible] کی تاکید فرمائی ہے آپ کا ارشاد ہے کہ "نماز کے بعد خدا تعالیٰ کے نزدیک سب سے پیارا

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ حُسْنًا ۚ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ (العنکبوت)

اور ہم نے انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ والدین سے حسن سلوک سے پیش آئے اور اگر وہ تمہیں مجبور کریں کہ تم میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کا تمہیں علم نہیں تو تم ان کی اطاعت نہ کرو۔

آنحضرتؐ نے بھی والدین کی اطاعت و فرمانبرداری کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ "والدین کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور والدین کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے" آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ خدا تعالیٰ نے تم پر ماں باپ کی نافرمانی کو حرام کر دیا ہے اور جو شخص ماں باپ کی نافرمانی کرتا ہے اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا نیز آپ نے ایک حدیث میں والدین کی نافرمانی کو کبیرہ گناہوں میں سے بتایا ہے۔

۳۔ مالی و جسمانی خدمت:۔ والدین کا تیسرا حق یہ ہے کہ ان کی مالی و جسمانی ہر طرح سے خدمت کی جائے۔ والدین اگر نادار و غریب یا بوڑھے ہوں تو انہیں تمام ضروریات زندگی مثلاً روٹی کپڑا وغیرہ بہم پہنچائی جائیں جب وہ بیمار ہوں تو ان کا علاج کرایا جائے غرض ہر قسم کی اعانت و خدمت کی انہیں ضرورت ہو اسے پورا کیا جائے اور ان کی تمام تکالیف کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ والدین کی مالی خدمت و امداد کے بارے میں قرآن پاک نے بھی تاکید کی ہے۔ فرمایا۔

قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ (البقرہ)

(اے نبی) کہہ دیجئے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو وہ والدین اور رشتہ داروں کے لیے ہے۔

والدین کی خدمت کے بارے میں نبی کریمؐ سے متعدد احادیث مروی ہیں۔ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے پاس

مال ہے اور میرا باپ میرے کا محتاج ہے آپ نے فرمایا تو اور تیرا مال دونوں تیرے باپ کی ملکیت ہیں۔ تمہاری اولاد تمہاری پاک کمائی ہے اس لیے تم اپنی اولاد کی کمائی سے بےشک کھاؤ (ابوداؤد)

متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالات میں والدین کی خدمت جہاد سے بھی افضل ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص یمن سے آیا اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد میں شرکت اجازت چاہی۔ آپ نے فرمایا کیا تیرے ماں باپ ہیں؟ عرض کی ہاں۔ آپ نے فرمایا جاؤ پہلے ان سے اجازت حاصل کرو اور اگر وہ اجازت نہ دیں تو ان کے حکم کی تعمیل کر کیونکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک اس کی بندگی کے بعد خدمت والدین سے بہتر اور کوئی عمل نہیں ہے۔ نیز آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ سب سے بڑا جہاد ماں باپ کی اچھی طرح خدمت کرنا ہے۔

**۴۔ اقربا سے سلوک:** والدین کا چوتھا حق یہ ہے کہ ان کے تمام رشتہ داروں بلکہ دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور انہیں احسانات سے نوازا جائے۔ والدین کے اقربا اور احباب سے حسن سلوک صرف والدین کی زندگی میں ہی نہیں بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی کرتے رہنا چاہیئے کیونکہ اس طرح ان کی روحوں کو سکون حاصل ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس امر کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھ سے ایک بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے کیا میرے لیے کوئی توبہ ہے؟ آپ نے فرمایا کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟ عرض کیا نہیں۔ آپ نے پھر فرمایا کیا تمہاری خالہ ہے؟ جواب دیا ہاں آپ نے فرمایا کہ اس کے ساتھ نیکی کرو۔ (ترمذی) ایک موقعہ پر آپ نے فرمایا کہ جس نے میرے چچا کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی چچا باپ کی مثل ہوتا ہے۔ (ترمذی) نیز ایک موقعہ پر آپ نے حضرت عباسؓ کی زکوٰۃ اپنے پاس سے دی اور فرمایا کہ چچا

بھی تو باپ کے مثل ہوتا ہے (ترمذی)

۵۔ دعائے مغفرت:۔ والدین کا ایک حق یہ بھی ہے کہ ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد اولاد ان کیلئے بخشش و مغفرت کی دعا کرتی رہے اور تلاوت قرآن پاک اور دعاؤں سے انہیں ثواب پہنچاتی رہے۔ اس طرح ان کی نیکیوں میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ والدین کے لیے دعائے مغفرت کرنا انبیاء کی سنت ہے۔ قرآن پاک میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت نوحؑ کی ان دعاؤں کا ذکر ہے جو انہوں نے اپنے والدین کیلئے مانگیں۔ اس کے علاوہ قرآن پاک نے مسلمانوں کو بھی اس کی تلقین کی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا:

قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۔

کہو کہ اے پروردگار! تو ان پر رحم کر جس طرح انہوں نے مجھے (مہر و محبت سے) بچپن میں پالا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس امر کی تاکید کی ہے چنانچہ ایک شخص نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ "یا رسول اللہ کیا والدین کی وفات کے بعد بھی ان کا کوئی حق ادا کرنے کے لیے رہ جاتا ہے"؟ آپؐ نے فرمایا ہاں"۔ ان کے لیے نماز پڑھ اور استغفار کر، ان کے وعدوں کو پورا کر، ان کے قرابت داروں سے بھلائی کر اور ان کے دوستوں کی تعظیم کر"۔ نیز آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ کسی بندے کے والدین یا ان میں سے ایک مر جاتا ہے اور وہ ان کا نافرمان رہا ہے پھر وہ ان کے لیے دعا اور استغفار کرتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کو سعادتمندوں میں لکھ لیتا ہے

## ثمرات و فوائد

والدین کے ساتھ حسن سلوک، ان کی اطاعت و خدمت اور ان کے دیگر حقوق

کی بجا آوری سے دنیا و آخرت میں بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔

**۱۔ دنیاوی فوائد** | جو شخص سچے دل سے والدین کی خدمت کرتا ہے تو خدا اور رسول کا دل اس سے خوش ہوتے ہیں اور ایسے شخص کو دنیا میں عزت و کامیابی حاصل ہوتی ہے آنحضورؐ کے فرمان کے موجب اس کی عمر میں درازی کر دی جاتی ہے اور اس کے رزق میں کشادگی و فراخی ہوتی ہے۔

**۲۔ اخروی فوائد** | خدمت والدین کے آخرت میں بھی بے شمار فوائد ہیں۔ والدین کی خدمت کرنے والا جنت کا حقدار ہو جاتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ باپ جنت کا درمیانہ دروازہ ہے تو چاہے تو اسے ضائع کر دے اور چاہے تو محفوظ رکھ۔

# ۳۔ حقوق اولاد

**مفہوم** | حقوق اولاد سے مراد وہ مراعات یا وہ باتیں ہیں جو اولاد کو والدین کی جانب سے حاصل ہوتی ہیں یا ان سے مراد وہ ذمہ داریاں ہیں جو والدین پر اولاد کے لیے عائد ہوتی ہیں۔

## اہمیت

حقوق اولاد کی اہمیت کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جا سکتا ہے۔

**۱۔ حسن معاشرت کا تقاضا** | حسن معاشرت کا اور معاملات کی صفائی کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرے کے تمام افراد کے مناسب و منصفانہ حقوق ▪ کم ہوں اور انہیں زیادہ تر بطریق احسن ادا کیا جائے چنانچہ اسلام نے معاشرتی و تمدنی تعلقات میں جو حقوق

قائم کئے ہیں، وہ دیگر تمام مذاہب کے مقرر کردہ حقوق کی نسبت زیادہ معقول ، منصفانہ اور مکمل ہیں۔ دوسرے مذاہب میں والدین ، بزرگوں اور بڑوں کا تو خیال رکھا گیا ہے لیکن اولاد ، بچوں اور چھوٹوں کو عام طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض جگہ بچوں کو زندہ دفنا دیا جاتا ہے یا دیوتاؤں کی نذر چڑھا دیا جاتا ہے۔ اسلام نے حسن معاشرت کے پیش نظر تقسیم حقوق میں بڑوں اور چھوٹوں کا کوئی امتیاز مدنظر نہیں رکھا بلکہ چھوٹوں کے بھی بڑوں کی طرح مناسب حقوق قائم کئے ہیں۔ اس امر کی تائید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ "وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کی عزت نہیں کرتا (ترمذی) اسی اصول کے پیش نظر اسلام نے جہاں والدین کے حقوق مقرر کئے ہیں، وہاں اولاد کے حقوق بھی قائم کر دیئے ہیں۔

۲۔ **والدین کے مفادات:۔** حقوق العباد کی بنیاد "احسان کا بدلہ احسان" کے اصول پر قائم ہے اور معاشرتی طور پر ایک دوسرے سے احسانات کے بدلے میں حقوق حاصل ہوتے ہیں مثلاً والدین کو اولاد کی طرف سے حقوق اس لئے حاصل ہیں کہ انہوں نے اولاد کی پیدائش ، پرورش اور تربیت کی ہوتی ہے۔ حقوق اولاد پر غور کیا جائے تو یہاں بھی یہی اصول کار فرما نظر آتا ہے اولاد سے والدین کے بہت سے مفادات وابستہ ہیں مثلاً ، جذبہ محبت کی تسکین کی خوشی ، آئندہ زندگی میں ان کی خدمت و معاونت کی امید ، دنیا میں نیک نامی و شہرت کی توقع اور آخرت میں صالح اولاد کی صورت میں سربلندی وغیرہ انہی مفادات کی بنا پر اولاد کو والدین کی طرف سے حقوق حاصل ہیں۔

۳۔ **کتاب و سنت کی تاکید:۔** اولاد کی زندگی کی تکمیل اور نشوونما کی تاکید قرآن مجید اور احادیث نبوی میں بھی موجود ہے۔

اسلام سے قبل نہ صرف یہ کہ اولاد کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اولاد کی زندگی کو بھی کچھ وقعت نہیں دی جاتی تھی اور اکثر نہایت بے رحمی اور سفاکی سے قتل و زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ پہلا سبب مذہبی تھا کہ لوگ اپنے دیوتاؤں اور ہبل کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنے بچوں کو ذبح کر کے ان پر بھینٹ چڑھا دیتے تھے اور قرآن پاک نے اس رسم کا یوں قلع قمع کیا۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام:)

تحقیق وہ لوگ خسارے میں ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے لاعلمی میں قتل کیا۔

قتل اولاد کا دوسرا سبب عربوں کا عام فقر و فاقہ تھا۔ اسلام نے اس بے بنیاد نظریہ کی یوں تردید کی کہ روزی رساں تو وہی خالق کائنات ہے جو ہر ایک کو روزی مہیا کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے

وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا

اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی بے شک ان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے۔ (بنی اسرائیل:۳۱)

اولاد کشی کا تیسرا سبب یہ تھا کہ لوگ لڑکیوں کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اپنے نام نہاد ننگ و عار کے خلاف سمجھتے تھے کہ اپنی لڑکی کسی دوسرے شخص کے عقد میں دیں۔ اسی سبب سے وہ لڑکی پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ دیتے یا زندہ درگور کر دیتے تھے۔ جیسا کہ قبیلہ بنی تمیم کے سردار قیس بن عاصم نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تسلیم کیا کہ اس نے اپنی دس لڑکیوں کو زندہ درگور کیا تھا اسلام نے اس قبیح رسم کو بھی ختم کیا اور قرآن حکیم نے بدبختوں کے دردناک انجام کا

نقشہ ان الفاظ میں کھینچا :-

وَاِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (التکویر)

اور جب زندہ درگور کی ہوئی بچی سے (قیامت کے روز) پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی تھی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حفاظت اولاد ہی کے پیش نظر فرمایا کہ "قتل اولاد شرک جیسے بڑے گناہوں میں شمار ہوتا ہے"۔

## اولاد کے حقوق

قرآن و احادیث سے اولاد کے مندرجہ ذیل حقوق ثابت ہوتے ہیں۔

۱۔ پرورش و رضاعت:۔ اولاد کا سب سے پہلا حق پرورش کا ہے۔ اسلام نے اولاد کی زندگی محفوظ کرنے کے ساتھ پرورش کا فریضہ بھی والدین پر عائد کیا ہے اور اس ضمن میں تاکید کی ہے کہ وہ تنگی اور افلاس سے نہ ڈریں۔ یہ فریضہ لڑکے کی صورت میں، بلوغت تک اور لڑکی کی صورت میں شادی تک ادا کرنے کا حکم ہے۔ اس دوران بچے کی صحت، صفائی، نشوونما لباس و طعام اور دیگر باتوں کی پوری پوری خبر گیری کی جائے اور اس سلسلے میں جس قدر مصائب و آلام پیش آئیں انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنا چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پرورش اولاد کی بہت تلقین فرمائی ہے اور بالخصوص لڑکی کے بارے میں خصوصی تاکید کی ہے کیونکہ لڑکی خلقاً ضعیف و کمزور ہوتی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ لڑکی کی پرورش والدین اور دوزخ کے بیچ پردہ ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو وہ شخص اور میں قیامت کے روز اس طرح ہوں گے جس طرح یہ انگلیاں اور آپ نے اپنی شہادت کی اور درمیانی انگلیوں کو ملا کر دکھایا۔ (مسلم)

ایک موقع پر آپ نے صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا کیا میں تم کو بہترین صدقہ سے آگاہ کروں؟ وہ اپنی بچی کے ساتھ سلوک کرنا ہے جو تیری طرف لوٹائی گئی ہو (یعنی طلاق یافتہ یا بیوہ) اور تیرے سوا اب اس کے لیے کوئی کمانے والا نہیں۔

(ابن ماجہ)

پرورش کے ساتھ رضاعت بھی اولاد کا حق ہے یعنی پیدائش کے بعد دو سال تک بچے کو والدہ کا دودھ پلایا جائے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

| | |
|---|---|
| وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ (البقرۃ: ۲۳۳) | اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک پلائیں یہ اس کیلئے ہے جو رضاعت کی مدت پوری کرنا چاہتا ہے۔ |

۲۔ تعلیم و تربیت:۔ اولاد کا دوسرا حق تعلیم و تربیت کا ہے جسمانی پرورش کے علاوہ والدین پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ اولاد کو تعلیم دلائیں اور روحانی و اخلاقی تربیت دیں۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے:۔

| | |
|---|---|
| يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (التحریم: ۶) | اے ایمان والو اتم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو (دوزخ کی) آگ سے بچاؤ۔ |

اس حکم خداوند کے پیش نظر والدین پر لازم آتا ہے کہ اپنی اولاد کو حسب استطاعت اعلیٰ دنیاوی تعلیم دلائیں تاکہ وہ اپنی روزی خود کما سکیں، اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پال سکیں اور باعزت زندگی بسر کریں۔ اس کے علاوہ دینی تعلیم سے بھی آراستہ کریں تاکہ وہ صحیح مقصد حیات سے واقف ہو کر نیک سیرت و سعادت مند بنیں اور قوم و ملک کے مفید افراد ثابت ہوں۔

اس امر کی مزید وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز آدمی کے ساتھ سب سے پہلے جھگڑنے والے اس

سے جیل پھل گے وہ خدا تعالیٰ سے کہیں گے کہ اے اللہ! الٰہی اس سے ہماری داد لے ہم ناواقف تھے اور اس نے ہمیں علم سکھایا نہیں جو کچھ سکھانا فرض تھا اس نے دکھایا اور ہم جاہل رہ گئے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں تربیت اولاد کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ کوئی باپ اپنے بچے کو حسن ادب سے بہتر عطیہ نہیں دیتا (ترمذی) ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ انسان کا اپنی اولاد کو ادب سکھانا ایک صاع (۳ سیر) غلہ خیرات کرنے سے بہتر ہے (ترمذی) دینی تربیت کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ جب تمہارے بچے سات برس کے ہو جائیں تو ان کو نماز پڑھایا کرو اور جب دس برس کے ہو جائیں تو انہیں مار مار کر نماز پڑھاؤ اور اس وقت جگہ جدا کر دو (ابوداؤد)

**۳۔ شفقت و محبت:-** اولاد کا تیسرا حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ رحمت و مودت اور شفقت و محبت کا سلوک کیا جائے اور ان پر شدید ظلم و زیادتی نہ کی جائے۔

اسلام جہاں اولاد کو قتل کرنے، بتوں کی بھینٹ چڑھانے، زندہ درگور کرنے اور ان پر شدید ظلم کرنے سے روکتا ہے وہاں اس امر کی بھی تاکید کرتا ہے کہ اولاد کے ساتھ محبت اس قدر شدید بھی نہ ہونی چاہئے کہ انسان خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کو پس پشت ڈال دے، اولاد کی خاطر حرام ذرائع سے روزی کمانے لگے، اولاد کو برے کاموں سے روکنے کے لیے سرزنش نہ کرے اور نیک کاموں کی تاکید کرنے میں غفلت کا اظہار کرے۔ درحقیقت اسلام اولاد کے ساتھ اعتدال سے محبت کرنے کی تعلیم دیتا ہے چنانچہ قرآن پاک نے اولاد کو انسان کے لیے آزمائش قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۔ بے شک تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے آزمائش ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محبت اولاد کا اسوہ ہمارے سامنے ہے۔ ایک روز ایک دیہاتی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو صحابہ کے بچوں سے پیار کرتے دیکھ کر پوچھا کیا آپ بچوں کو چومتے اور پیار کرتے ہیں؟ ہم تو ایسا نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا کیا میں اس پر قادر ہوں کہ تیرے دل سے خدا نے جو رحمت نکال لی ہے اس کو پھر تیرے دل میں رکھ دوں (بخاری و مسلم)

ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسنؓ کو چوما اور پیار کیا۔ وہاں حضرت اقرع بن حابس تمیمی بھی بیٹھا تھا۔ اقرع نے کہا کہ میرے دس بیٹے ہیں لیکن میں نے ان میں سے کبھی کسی کو نہیں چوما۔ اس پر حضور نے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ جو کسی پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا (بخاری)

عدل و مساوات:۔ اولاد کا ایک حق عدل و مساوات بھی ہے۔ اسلام تمام اولاد میں عدل کرنا اور کامل مساوات قائم رکھنا ضروری قرار دیتا ہے۔ پرورش، تعلیم و تربیت، شفقت و محبت اور داد و دہش غرض ہر معاملہ میں سب اولاد میں مساوی سلوک رکھا جائے لڑکے اور لڑکی یا بڑے اور چھوٹے کا کوئی فرق و امتیاز ملحوظ نہ رکھا جائے کیونکہ عدل و انصاف قائم نہ رکھنے سے اولاد کے دل آپس میں پھٹیں گے باپ کے خلاف بھی نفرت پیدا ہو جائے گی اور بالآخر گھر کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

بعض لوگ لڑکوں کی تربیت کا خاص خیال رکھتے ہیں اور لڑکیوں کی نسبت ان سے ترجیحی سلوک کرتے ہیں۔ اسلام نے اسے سخت ناپسند کیا ہے اور لڑکیوں اور لڑکوں میں یکساں سلوک کی تاکید کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس امتیاز کو ناپسند فرمایا ہے۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا جس شخص کے ہاں کوئی بچی پیدا ہوئی اور اس نے جاہلیت کے طریقہ پر زندہ دفن نہیں کیا اور نہ ہی اس کو حقیر جانا اور نہ لڑکوں کو اس کے مقابلہ میں ترجیح دی تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جنت میں داخل کرے گا۔

اسی طرح دنیا کے اکثر مذاہب میں بڑے اور چھوٹے کا فرق رکھا جاتا ہے اور سب سے بڑے لڑکے کو خصوصی حق دیا جاتا ہے۔ اسلام نے اسے بھی سخت ناپسند کیا ہے اور سب لڑکوں کو باپ کے مال میں یکساں حقدار ٹھہرایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکوں میں سے ایک کو بلا وجہ کوئی عطیہ دینے اور باقیوں کو محروم رکھنے کو ظلم سے تعبیر فرمایا ہے جیسا کہ حدیث ہے۔

ایک صحابیؓ نے اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کو غلام بخشا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنانا چاہا۔ چنانچہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام بخشا ہے اس نے عرض کیا نہیں آپ نے فرمایا تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ بنوں گا۔ (ابوداؤد)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ اللہ سے ڈرو! اور اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو

۵۔ رسوم پیدائش اولاد کا ایک حق یہ بھی ہے کہ پیدائش پر والدین خوشی منائیں اور بعض ضروری رسوم بھی ادا کریں۔ بچہ کی پیدائش کے سلسلے میں اسلامی رسوم یہ ہیں۔

الف۔ تحنیک: بچہ پیدا ہونے کے بعد نہلا دھلا کر دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنی چاہیے۔ مروی ہے کہ جب حضرت حسینؓ میں سے ایک صاحب پیدا ہوئے تو آپ نے دائیں کان میں اذان دی اور بائیں میں اقامت کہی۔ اس کے بعد تحنیک یعنی کھجور وغیرہ چبا کر بچے کے تالو میں لگانا مستحب ہے۔

ب۔ عقیقہ: عقیقہ دراصل ان بالوں کو کہتے ہیں جو بچے کی پیدائش سے اس کے سر پر ہوتے ہیں۔ پھر اس جانور کو بھی عقیقہ کہنے لگے جو بچے کی پیدائش کے بعد شکر نعمت کے طور پر ذبح کیا جاتا ہے۔ عقیقہ ایک قسم کا صدقہ ہے اور ہر شخص پر لازم نہیں بلکہ صرف صاحب حیثیت کیلئے ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ سنت ہے اور زندگی میں کسی وقت بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ ساتویں روز ادا کرنا بہتر ہے اگر اس روز ادا نہ ہو سکے تو چودھویں یا پھر اکیسویں دن ادا ہو سکتا ہے بلکہ اگر والدین تمام عمر ادا نہ کر سکیں تو اولاد خود اپنا عقیقہ ادا

کر سکتی ہے۔

عقیقہ ادا کرنے کی صورت یہ ہے کہ قربانی کا جانور (بھیڑ، بکری، دنبہ نر یا مادہ) ذبح کیا جائے
لڑکی کی طرف سے ایک اور لڑکے کی طرف سے دو اور اگر دو کی استطاعت نہ ہو تو ایک
بھی کافی ہے۔ گوشت کچا یا پکا کر احباب حسب طلب اور فقراء و مساکین میں تقسیم کیا جائے۔
بچے کا سر منڈایا جائے اور بالوں کے برابر چاندی صدقہ کر دی جائے۔ اس کے علاوہ
بچے کا خوبصورت سا نام رکھا جائے۔

**ختنہ**: ختنہ کرانا اسلامی شعار ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ
پانچ چیزیں فطرت ہیں۔ زیر ناف بال مونڈنا، ختنہ کرانا، مونچھیں کترنا، بغل کے بال
اکھاڑنا اور ناخنوں کا لینا۔ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ ختنہ ضروریات دین سے ہے
ختنہ زیادہ سے زیادہ بلوغت کی عمر تک ہو جانا چاہیے۔ اس سے زیادہ تاخیر کرنا
مناسب نہیں۔

**۴۔ شادی**: اولاد کا یہ بھی حق ہے کہ جب اولاد بالغ ہو جائے تو حسب استطاعت
اس کی شادی کا انتظام کریں۔ شادی کرتے وقت محض اپنی مصلحتوں کو ملحوظ نہ رکھیں۔
بلکہ اولاد کی رضامندی حاصل کریں۔ طرفین کی سیرت، صورت، عمر، تعلیم، دین،
خاندان وغیرہ میں جس قدر ہم آہنگی و یکسانیت ممکن ہو سکے اور اچھا ساتھی تلاش کیا جا
سکے بہتر ہے۔ بالخصوص لڑکی کیلئے بہترین شوہر کا انتخاب از حد ضروری . . .
ہے۔ لڑکے کی رضا اس سے پوچھ کر اور لڑکی کی رضا قرائن سے معلوم کی جا سکتی ہے۔
شادی میں اولاد بالخصوص لڑکی کی رضامندی حاصل کرنے پر حضور اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم نے بہت تاکید فرمائی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ کنواری عورت سے نکاح کے
معاملے میں اجازت حاصل کی جائے وہ خاموش رہے تو اسی کو اس کی اجازت سمجھا جائے
اور اگر انکار کرے تو اس پر جبر نہ کیا جائے۔

ایک مرتبہ ایک لڑکی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اس کے باپ نے اس کا نکاح کر دیا ہے اور وہ اس نکاح سے ناخوش ہے آپؐ نے لڑکی کو اختیار دے دیا کہ نکاح برقرار رکھے یا توڑ دے (ابو داؤد)

۷۔ **میراث** : اولاد کا ایک حق یہ بھی ہے کہ باپ کی وفات کے بعد اس کی میراث میں حصہ لے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

| | |
|---|---|
| يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۔ | اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری اولاد کے متعلق حکم دیتا ہے کہ لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر (میراث میں حصہ دو) |
| (النساء : ۱۱) | (النساء : ۱۱) |

اسلامی قانون وراثت کے مطابق لڑکے کو لڑکی کی نسبت دگنا حصہ ملتا ہے اور کسی باپ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی زندگی میں اپنی اولاد میں سے کسی ایک لڑکے یا لڑکی کو بالکل محروم کر دے یا کسی ایک بچہ یا بچی کو پوری جائیداد کا وارث بنا جائے۔ بلکہ اسلام سب کے ساتھ عدل کا سلوک کرتا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ دنیا میں اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے جس نے لڑکی کو بھی باپ کی جائیداد میں حقدار ٹھہرایا۔

**ثمرات و فوائد**

اولاد کی پرورش تعلیم و تربیت اور ان کے دیگر حقوق کی ادائیگی ایک بہت بڑی قومی و دینی خدمت ہے جس کے دنیا و آخرت میں بہت سے فوائد ہیں۔

نیک اولاد صدقہ جاریہ ہے نیک اولاد سے دنیا میں نیک نامی حاصل ہوتی ہے آخرت میں اس کی دعاؤں اور نیک کاموں سے والدین کے درجات میں اضافہ ہوتا ہے۔

# ۳۔ رشتہ دار

**مفہوم** | رشتہ دار کے لیے عربی زبان میں لفظ 'اقرب' استعمال ہوتا ہے جس کی جمع 'اقارب' یا 'اقربا' ہے اور اس کے معنی قریبی یا نزدیکی ہیں۔ اصطلاحاً اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا والدین، اولاد اور زوجین کے بعد ہمارے ساتھ خاندانی تعلق ہوتا ہے یعنی چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ وغیرہ۔

عربی زبان میں رشتہ دار کے لیے "اقرب" کے علاوہ لفظ 'رحم' بھی مستعمل ہے جس کی جمع 'ارحام' ہے اور اس کے معنی ماں کا پیٹ ہیں۔ چونکہ تمام رشتہ داروں کا تعلق والدین کے ذریعے سے ہوتا ہے اور والدین میں ماں کا مقام باپ سے بلند ہوتا ہے اس لیے اصولی طور پر تمام رشتہ دار رحم مادر کی نسبت سے ہی تعلق رکھتے ہیں اور ارحام کہلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عربی محاورے میں رشتہ داروں سے حسن سلوک کو صلۂ رحمی کا نام دیا جاتا ہے اور ان سے تعلق توڑنے کو قطع رحمی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قرآن پاک میں رشتہ دار کے لیے "ذوی القربیٰ" اور "ذوی الارحام" دو لفظ ہی استعمال ہوئے ہیں جن کا مطلب "قرابت دار" اور "رحم والے" ہیں۔

**اہمیت:**

رشتہ داری کی اہمیت مندرجہ ذیل پہلوؤں سے واضح ہوتی ہے۔

۱۔ __فطری تعلق__: رشتہ داروں کے ساتھ طبعی و فطری محبت ہوتی ہے اور ان کے ساتھ تعلق قدرتی، حقیقی اور غیر مصنوعی ہوتا ہے اس لیے اگر ہم اسے توڑنا بھی چاہیں اور رشتہ داری سے الگ ہونا چاہیں تو ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ رشتہ داری میں اصل اشتراک رحم اور ہے برخلاف دوسرے تعلقات کے جو محض قوم و ملک

مذہب، پیشہ اور دیگر نظریاتی اشتراک پر استوار ہوتے ہیں اور ان کے ختم ہونے کا ہمیشہ امکان رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر رشتہ داروں میں کبھی ناراضگی یا رنجش پیدا بھی ہو جائے تو صلح وصفائی کا قوی امکان رہتا ہے درحقیقت یہ رشتہ والدین، اولاد اور زوجین کے بعد سب سے مضبوط ہوتا ہے۔

۲۔ **استحکام معاشرہ**:۔ رشتہ داروں سے جو معاشرت قائم ہوتی ہے وہ نہایت مستحکم اور پائیدار ہوتی ہے۔ کیونکہ رشتہ دار طبعی و فطری تعلق کی بنا پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون و ہمدردی اور ایثار و قربانی اور حسن سلوک کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رشتہ داروں کی موجودگی میں انسان اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھتا بلکہ اپنے آپ کو ایک مضبوط جماعت منسوب کرتا ہے اور حالات کا نہایت قوی القلب ہو کر مقابلہ کرتا ہے۔

مستحکم رشتہ داریاں بہت بڑی قوت ہوتی ہیں اور ان کے تعاون سے بڑے بڑے تعمیری کام ہو سکتے ہیں۔ رشتہ داروں کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا ہے تو وہ انتہائی خلوص و جان نثاری سے اسے سرانجام دیتے ہیں اور مختلف امور میں حتی الوسع ایک دوسرے کے ساتھ تعاون و امداد کرتے ہیں۔ ہر شخص کے پیش نظر محض اس کی ذاتی منفعت ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ سب رشتہ داروں کے اجتماعی مفاد کو مدنظر رکھتے ہیں اس طرح رشتہ داروں کی باہمی امداد و تعاون سے معاشرہ خوشحال و فارغ البال ہو جاتا ہے اور ایسے معاشرے کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ **قرآن پاک میں تاکید**:۔ رشتہ داری کی اہمیت واضح کرنے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن پاک میں کم از کم بارہ مقامات پر رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی صریح تاکید وارد ہوئی ہے۔ اور اس حسن سلوک کو احسان نہیں بلکہ انسان کا فرض قرار دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَآتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (روم ۲۸) پس قرابت دار کو اس کا حق ادا کر

رشتہ داری کی اہمیت اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت و تبلیغ حق میں بے شمار مصیبتیں اور صعوبتیں برداشت کیں اور امت پر بے حد و کنار احسان کیے اس کا بدلہ فقط یہ طلب کیا کہ آپ کی امت رشتہ داروں سے حسن سلوک کرے اور ان کے حقوق ادا کرے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے

قُلْ لَّا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰی۔ (شوریٰ) (اے نبی) کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی اجر طلب نہیں کرتا سوائے اس بات کے کہ تم اپنے رشتہ داروں میں محبت و مودت پیدا کرو

اس کے علاوہ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر مختلف انداز میں حقوق اقارب کے ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے مثلاً ایک مقام پر ارشاد فرمایا:۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبٰی۔ بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

۳۔ احادیث نبویؐ:۔ آنحضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں صلہ رحمی کی اہمیت بیان فرمائی ہے۔ ایک مرتبہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ کون سا آدمی افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہو، اپنے رشتہ داروں سے بہتر اچھا سلوک کرتا ہو۔ اور لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتا ہو اور برائیوں سے روکتا ہو۔

ایک حدیث میں آپ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں رحمٰن ہوں اور رحم مجھ سے نکلا ہے جو رحم کو ملائے گا میں اسے اپنی رحمت سے ملاؤں گا۔ اور جو رحم کو قطع کرے گا میں اس سے قطع کروں گا۔ ایک دوسری حدیث میں آپ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔ ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا ہے کہ اپنی قرابت کو زندہ رکھو چاہے سلام

کے ذریعے ہی ہو۔

## اقربا پروری کی حد

رشتہ داروں کی مدد اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ایک قابل تحسین جذبہ اور بہت بڑی نیکی ہے۔ لیکن اس میں بھی اعتدال ضروری ہے۔ اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ انسان اقربا نوازی میں ایسی حد تک بڑھ جائے کہ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز ختم ہو جائے اور ایک واقعے پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ کیا اپنے خاندان سے محبت رکھنا تعصب میں داخل ہے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں، تعصب یہ ہے کہ تو اپنے خاندان کی بے انصافی میں مدد کرے۔

## حقوق اقارب

قرآن و سنت اور دیگر تعلیمات اسلام کی رو سے رشتہ داروں کے حقوق مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حسن سلوک: رشتہ داروں کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا جائے۔ ان کے ساتھ محبت، شفقت اور حلم و بردباری کا برتاؤ کیا جائے اور کسی قسم کی سختی یا زیادتی نہ کی جائے۔ قرآن پاک میں رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسے توحید و عبادت اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْـًٔا — اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک
وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى — نہ ٹھہراؤ اور والدین اور رشتہ داروں کے
(النساء: ) — ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ (۳۶)

تمام رشتہ دار امیر ہوں یا غریب، بلند مرتبہ ہوں یا کم مرتبہ، نزدیکی ہوں یا دور

کا تعلق رکھتے ہوں سبھی سلوک کے مستحق ہیں۔ یہاں تک کہ اگر رشتہ دار غیر مسلم ہوں تو بھی حسن سلوک کے حقدار ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے غیر مسلم رشتہ داروں کے متعلق فرمایا کہ فلاں فلاں میرے دلی رفیق نہیں میرا اصلی دوست اللہ تعالیٰ اور نیک مسلمان ہیں لیکن ان غیر مسلم اقرباء کے ساتھ میرا خون کا رشتہ ہے میں اس کو بھلائی کے ساتھ زندہ رکھوں گا۔ البتہ جس قدر کوئی رشتہ دار قریبی تعلق رکھتا ہوگا اسی قدر وہ زیادہ حسن سلوک کا حقدار ہوگا اور جتنا دور کا تعلق رکھے گا اسی طرح اس کے حقوق کم ہوں گے۔ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں کس سے بھلائی کروں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی ماں سے اور باپ سے اور بھائی بہن سے اور پھر اس کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں سے رشتہ دار برا بھی ہو تو بھی اس سے حسن سلوک کیا جائے حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے کچھ رشتہ دار ہیں۔ میں ان سے تعلق رکھنا چاہتا ہوں اور وہ توڑتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ بھلائی کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ برائی کرتے ہیں۔ میں ان سے نرمی کرتا ہوں اور وہ سختی کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم ایسے ہی ہو جیسا کہ تم کہتے ہو تو جب تک اس حال پر رہو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ تمہاری مدد پر مقرر رہے گا۔

۲۔ **مالی اعانت**:۔ رشتہ داروں کا دوسرا حق یہ ہے کہ ان کی مالی اعانت کی جائے۔ ایک خاندان کے سب افراد یکساں طور پر مالدار نہیں ہوتے بلکہ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو روٹی کپڑے کو بھی محتاج ہوتے ہیں۔ اس لیے اہل ثروت و دولت پر لازم ہے کہ وہ اپنے مفلس و نادار رشتہ داروں کو مالی امداد دیں اور ان کیلئے ضروریات زندگی مثلاً کھانا پہننا اور رہائش وغیرہ کا انتظام کریں بلکہ اگر کوئی یتیم ہو تو اس کی

پرورش و تربیت کا بھی انتظام کریں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی غریب رشتہ دار طالب علم مستحق ہو تو اسے تعلیم کے سلسلہ میں مالی امداد دی جائے۔

قرآن پاک میں متعدد جگہ رشتہ داروں پر مال صرف کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہوا ہے۔

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۔ (البقرۃ) (یعنی) کہہ دیجئے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو وہ والدین، رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے رشتہ داروں کی مالی اعانت فرماتے تھے۔ آپ نے اپنے چچا زاد بھائی حضرت علیؓ کی کفالت کی۔ علاوہ ازیں آپ نے صحابہ کرامؓ کو بھی اسی امر کی تاکید فرمائی۔ چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص عام غریبوں کو صدقہ دے گا اسے ایک درجہ ثواب ملے گا اور جو شخص رشتہ داروں پر خرچ کرے گا۔ اسے دگنا ثواب ملے گا۔

۲۔ تعاون و ہمدردی : رشتہ داروں کا ایک حق یہ بھی ہے کہ دکھ سکھ، رنج و راحت، بیماری و صحت، اور شادی و موت ہر موقع پر ان کے ساتھ ہمدردی و تعاون کا اظہار کیا جائے اور نہ صرف مالی بلکہ ہر قسم کی روحانی و اخلاقی امداد کی جائے۔ اگر کوئی رشتہ دار بیمار ہو تو اس کی عیادت و تیمارداری کی جائے اگر کوئی کسی مصیبت و مشکل میں پھنسا ہو تو اسے نجات دلانے کی کوشش کی جائے اگر کوئی بے راہ روی کی زندگی بسر کرنے لگے تو اسے راہ راست پر لانا بھی رشتہ داروں کے ساتھ تعاون کرنا ہے اور ان کی الجھنیں دور کرنے کیلئے انہیں مشورے دینا بھی ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ رشتہ داروں کے ساتھ ہر نیک کام میں تعاون کیا جائے اور ہر دکھ و مصیبت میں ان کی مدد کی جائے اور اظہار ہمدردی کیا جائے۔

۴۔ عفو و درگزر :- رشتہ داروں کا یہ بھی حق ہے کہ ان کے ساتھ عفو و درگذر کا سلوک کیا جائے اور ان سے قطع تعلق سے گریز کیا جائے۔ بلکہ ان کی غلطیوں اور زیادتیوں کو بڑی عالی حوصلگی اور فراخدلی سے برداشت کرتے ہوئے تعلق برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے ایک رشتہ دار مسطح بن اثاثہ کی مالی اعانت کرتے تھے لیکن جب مسطح نے آپ کی بیٹی ام المومنین حضرت عائشہؓ پر بہتان طرازی میں حصہ لیا تو آپ نے اس کی امداد بند کر دی۔ تو اس پر قرآن پاک میں یہ حکم نازل ہوا

وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ (النور)

اور تم میں سے جو فضل اور کشائش والے ہیں وہ اہل قرابت، مدد محتاجوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھائیں۔ (النساء)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں رشتہ داروں سے قطع تعلق کی ممانعت فرمائی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ جو صلہ رحمی نہیں کرتا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ قطع رحمی کرنے والے کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔

## ثمرات و فوائد

رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرنے اور ان کے حقوق ادا کرنے سے مندرجہ ذیل ثمرات و فوائد حاصل ہوتے ہیں :-

۱۔ خانگی مسرت و اطمینان :- رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا بنیادی فائدہ یہ ہے کہ اس سے پورے خاندان کا ماحول پرسکون و خوشگوار رہتا ہے کیونکہ خاندان کے تمام افراد میں ایک دوسرے کے لیے خلوص و ہمدردی، ایثار و قربانی اور عفو و درگذر کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ تمام خاندانی جھگڑے اور تنازعات ختم ہو کر مسرت و

اطمینان کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔

۲۔ خیر و برکت :۔ رشتہ داروں سے حسن سلوک خیر و برکت کا بھی موجب ہے خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کی روزی میں برکت دیتا ہے اور مال و دولت میں کشائش عطا کرتا ہے۔ نیز ان کی عمریں بھی دراز کرتا ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے، کہ "جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت کی جائے اور اس کی عمر دراز کی جائے ایسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے" (بخاری)

۳۔ آخرت میں کامیابی :۔ رشتہ داروں سے حسن سلوک کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان کو اخروی زندگی میں کامیابی حاصل ہوتی ہے اور وہ جنت کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ ایک حدیث میں آپ نے فرمایا کہ جو صلہ رحمی نہیں کرتا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔

۴۔ کفارہ گناہ :۔ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے اور ان سے قطع تعلق کرنا اعمال کی نا مقبولیت کا باعث بنتا ہے۔

ایک شخص نے حضرت رسول خدا کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں ایک کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوا ہوں کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ آپ نے پوچھا کیا تیری ماں زندہ ہے؟ عرض کیا نہیں۔ پھر آپ نے پوچھا کیا تیری خالہ زندہ ہے؟ عرض کیا ہاں۔ آپ نے فرمایا تو اس کے ساتھ حسن سلوک کر۔

# ہمسایہ

**مفہوم** | ہمسایہ کے لیے لفظ "جار" استعمال ہوتا ہے جس کی جمع "جیران" ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے قرب و جوار اور پڑوس میں رہتے ہوں۔ شریعت میں ہمسائیگی کی حد اپنے مکان سے چاروں طرف چالیس گھروں تک ہے جس میں اپنے و بیگانے، رشتہ دار و غیر رشتہ دار اور مسلم و غیر مسلم سب شامل ہیں اگرچہ ہمسایہ کا مفہوم نہایت وسیع ہے اور اس کا اطلاق صرف ہم رہائش پر ہی نہیں ہوتا بلکہ ہم مکتب، ہم پیشہ، ہم کاروبار اور ہم سفر وغیرہ سب ہمسائیگی کے مفہوم میں شامل ہیں تاہم ہمسایہ سے عام طور پر مراد ہم رہائش یعنی ساتھ ساتھ رہنے والے ہی ہوتے ہیں

**ہمسایہ کے مدارج** | اسلام میں حسن سلوک کا معیار "قربت" ہے جو جتنا زیادہ قریب ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ حسن سلوک کا مستحق ہوگا۔ ہمسایہ کے معاملہ میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ سب قسم کے ہمسایوں میں فوقیت و برتری اس کو حاصل ہے جس کے علاوہ ہمسائیگی کے علاوہ کوئی اور دوہرا تعلق بھی ہو۔ کافر و غیر رشتہ دار ہمسایہ کا حق سب سے کم ہے کیونکہ اس کے ساتھ صرف ہمسائیگی کا تعلق ہے۔ مسلمان ہمسایہ کا اس سے زیادہ حق ہے کیونکہ وہ ہمسائیگی کے علاوہ اخوت اسلامی کا بھی، تعلق رکھتا ہے۔ مسلمان رشتہ دار ہمسایہ کا حق سب پر فائق ہے کیونکہ اس کا ہمسائیگی اور ہم مذہبی کے علاوہ تیسرا تعلق قرابت کا بھی ہے چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "غیر مسلم ہمسایہ کا ایک حق ہے، مسلمان ہمسایہ کے دو حق ہیں اور رشتہ دار ہمسایہ کے تین حق ہیں"۔

حضرت عائشہؓ نے ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ

میرے دو پڑوسی ہیں۔ میں تحفہ یا کوئی چیز کس کے پاس بھیجوں ؟ آپ نے فرمایا جس کا گھر تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہے (بخاری)

اہمیت ہمسایہ

ہمسایہ کی اہمیت مندرجہ ذیل دلائل سے واضح ہوتی ہے۔

۱۔ <u>معاشرتی ضرورت</u> :۔ ہمسایہ سے عمدہ تعلقات رکھنا ایک بہت بڑی معاشرتی ضرورت ہے۔ انسانی معاشرہ اور تمدن کی بنیاد اشتراک عمل اور باہمی تعاون پر قائم ہے۔ کیونکہ ہر انسان فطری طور پر دوسرے کا محتاج ہے اور کوئی شخص بھی بے نیازی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ رنج و غم، بیماری و دکھ، پریشانی و مصیبت اور تکالیف و خطرات میں اسے دوسروں کی امداد و اعانت کی ضرورت ہوتی ہے ان حالات میں سب سے پہلے جو انسان کی مدد و اعانت کو پہنچ سکتا ہے وہ اس کا ہمسایہ ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قریبی ہمسایہ کی اہمیت دور کے رشتہ داروں سے بھی زیادہ ہے

ہمسایہ کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ بوجہ قربت وہ نزدیکی وہ ہر وقت کا شریک رنج و راحت ہوتا ہے۔ اور اگر اس سے بہتر تعلقات نہ رکھے جائیں تو عین ممکن ہے وہ کسی وقت شر یا مصیبت کا باعث بن جائے۔ کیونکہ انسان کو تکلیف یا دکھ پہنچنے کا اسی سے اندیشہ ہو سکتا جو اس کے زیادہ قریب ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہمسایہ سے حسن سلوک کیا جائے اور خوشگوار تعلقات قائم کیے جائیں تاکہ انسان اس کے شر سے محفوظ رہے۔

۲۔ <u>قرآن و سنت میں تاکید</u> :۔ ہمسایہ کے ساتھ حسن سلوک اور اس کے حقوق ادا کرنے کی قرآن پاک میں بھی تاکید آئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ (النساء: ۳۶)

اور رشتہ دار ہمسایہ اور اجنبی ہمسایہ اور ہم مجلس کے ساتھ حسن سلوک کرو

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں ہمسایہ کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین ہے اور اس کے حقوق کی اہمیت بیان فرمائی ہے ۔ آپ نے فرمایا کہ جسے یہ پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسول اس سے محبت کریں یا جسے خدا اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے (مشکوٰۃ)
آپ کا یہ بھی فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہترین ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھیوں کے حق میں بہترین ہے اور بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں کے حق میں بہترین ہے (ترمذی) نیز آپ کا ارشاد ہے کہ حضرت جبرائیل آکر مجھے پڑوسی کے بارے میں اتنی زیادہ تاکید کرتے رہے کہ مجھے گمان ہوا کہ وہ ہمسایہ کو وارث ٹھہرا دیں گے ۔ (بخاری و مسلم)
ہمسایہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمسایہ کو انسان اخلاق کی کسوٹی قرار دیا ہے ۔ ایک مرتبہ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہمارے اعمال اچھے ہیں یا برے ؟ آپؐ نے فرمایا کہ جب تم ہمسایہ کو اپنی نسبت اچھا کہتے سنو تو سمجھو کہ تمہارے اعمال اچھے ہیں اور جب برا کہتے سنو تو سمجھو کہ تمہارے اعمال برے ہیں ۔

## حقوق ہمسایہ

اسلامی تعلیمات کی رو سے ہمسایہ کے مندرجہ ذیل حقوق ثابت ہوتے ہیں ۔
۱۔ حسن سلوک : ہمسایہ کا پہلا حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ عمدہ سلوک کیا جائے اور خوشگوار تعلقات قائم کئے جائیں ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "جو شخص اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے ۔ اسے چاہئے کہ اپنے پڑوسی سے حسن سلوک کرے"

ہمسایہ کے ساتھ حسن سلوک کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی دل داری کی جائے
اور اسے کبھی بھی ناراضگی کا موقع نہ دیا جائے بلکہ اسے دکھ و تکلیف اور ایذا پہنچانے
سے اجتناب کیا جائے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص اللہ اور روز
جزا پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے (بخاری) ایک دوسری حدیث
میں آپ کا ارشاد ہے کہ ہمسایہ کو ستانے اور تکلیف دینے والا دوزخ میں جائے گا

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ فلاں عورت نمازیں
تو بہت پڑھتی ہے روزے بھی بہت رکھتی ہے اور خیرات بھی بہت کرتی ہے لیکن
اس کی بدزبانی سے پڑوسی دکھی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ دوزخی ہے پھر عرض کیا گیا کہ
ایک دوسری عورت ہے جو نماز روزہ واجبی طور پر ادا کرتی ہے اور معمولی صدقہ
ہی دیتی ہے لیکن وہ پڑوسیوں کے حق میں بدزبان نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا وہ جنت
میں جائے گی (مشکوٰۃ)

ایک مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا کہ خدا کی قسم وہ مومن نہیں،
خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ کون؟ فرمایا وہ
شخص جس کا ہمسایہ اس کے شر سے محفوظ نہیں (متفق علیہ)

۲۔ صبر و تحمل: اسلام صرف ہمسایہ کو ضرر پہنچانے سے ہی نہیں روکتا بلکہ یہ بھی تقاضا
کرتا ہے کہ اگر ہمسایہ کی جانب سے تکلیف پہنچے تو اس سے درگزر کیا جائے اور صبر و
تحمل کا اظہار کیا جائے۔ ابتدائے اسلام میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کافر
پڑوسی بھی حد سے زیادہ تنگ کرتے تھے کہ آپ کے گھر جا کر ہنڈیا میں گندگی ڈال دیتے
تھے لیکن آپ اس سے زیادہ کچھ نہ کہتے کہ اے بنو عبد مناف! یہ کیسی ہمسائیگی ہے؟
ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ میرا پڑوسی مجھے
ستاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ صبر کرو۔ اس کے بعد وہ پھر شکایت لے کر آئے

آپ نے پھر وہی نصیحت کی۔ تیسری مرتبہ وہ پھر یہی شکایت لائے تو آپ نے فرمایا جاؤ اور اپنا سامان راستے میں ڈال دو۔ (یعنی گھر سے منتقل ہونے کی صورت بنا لو) انہوں نے ایسا ہی کیا۔ گزرنے والوں نے پوچھا کیا معاملہ ہے؟ تو انہوں نے پڑوسی کی بدسلوکی کا ذکر کیا۔ لوگوں نے پڑوسی کو برا بھلا کہا۔ وہ ان صحابیؓ کے پاس آیا اور کہا اب آپ مکان میں چلیں آئندہ مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی (ابوداؤد)

۳- امداد و اعانت :- ہمسایہ کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اس کی ضروریات کا خیال رکھا جائے۔ اور ہر ضرورت میں اس کی امداد و اعانت کی جائے۔ اگر بھوکا ہو تو کھانا کھلایا جائے۔ ضرورت مند ہو تو قرض دیا جائے۔ بیمار ہو تو عیادت کی جائے حتیٰ کہ اگر فوت ہو جائے تو اس کے جنازے کے ہمراہ جایا جائے۔ مختصر یہ کہ اس کے ہر رنج و غم میں شرکت کی جائے اور اس کی ہر ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس ضمن میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد احادیث مروی ہیں۔ ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ "اگر ہمسایہ تجھ سے قرض مانگے تو اسے دے اگر تجھ سے اعانت طلب کرے اعانت کر اور اگر اسے کوئی اور احتیاج و ضرورت ہو تو وہ بھی پوری کر"
ایک موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "وہ شخص کامل مومن نہیں جو خود تو سیر ہو کر کھائے اور اس کا ہمسایہ بھوکا رہے" (مشکوٰۃ) ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاریؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "جب تم سالن پکاؤ تو اس میں پانی ذرا زیادہ ڈال دو اور اس میں سے کچھ پڑوسی کے گھر بھیج دو" (مسلم)

۴- تحفے تحائف :- ہمسایہ کا ایک حق یہ بھی ہے کہ وقتاً فوقتاً انہیں تحفے تحائف بھیجے جائیں کیونکہ اس طرح آپس میں الفت و محبت پیدا ہوتی ہے اور تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اپنے ہمسائے کو تحفے

تحائف بھیجتے رہو اور اپنی خوشبو کے موقع پر پہلے بلایا کرو۔

ایک موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تو میوہ خریدے اور استطاعت ہو تو پڑوسی کے گھر میں بھیج اور اگر نہیں بھیج سکتا تو پوشیدہ رکھ تیرے بچوں میں سے کوئی اس پھل کو لے کر باہر نہ نکلے تاکہ پڑوسی کے بچوں کو تکلیف نہ ہو۔"

ہدیہ بیش قیمت چیز کا ہی بھیجنا ضروری نہیں بلکہ حسب استطاعت کوئی چیز بھی بھیجی جا سکتی ہے کسی معمولی چیز کو ہدیہ بھیجتے ہوئے یا لیتے عار و تردد نہیں ہونا چاہیے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان عورتوں سے ارشاد فرمایا کہ "تم میں سے کوئی پڑوسن کو ہدیہ دینے کو حقیر نہ سمجھے اگرچہ وہ بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو۔"

(بخاری و مسلم)

۵۔ **تحفظ مال و عزت** ۔ ہمسایہ کا ایک حق یہ بھی ہے کہ ان کی عزت و آبرو کا پاس کیا جائے۔ نہ خود کوئی ایسی بات کی جائے جس سے ان کی عزت پر حرف آئے اور نہ ہی کسی دوسرے کو ایسا کرنے دیا جائے نیز پڑوسیوں کے جان و مال کا خیال رکھا جائے اور ان کی عدم موجودگی میں حفاظت کی جائے۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ نے فرمایا کہ "زنا حرام ہے اللہ اور اس کے رسول نے اسے حرام کہا ہے لیکن سب بدکاریوں سے بڑھکر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے۔ چوری حرام ہے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کہا ہے لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بدتر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے چوری کرے۔"

## ثمرات و فوائد

حقوق ہمسایہ کی ادائیگی کے بہت سے فوائد میں جن میں سے اہم یہ ہیں۔

۱۔ صحیح معاشرت کی تشکیل : حقوق ہمسایہ کی ادائیگی سے لوگوں کے ایک دوسرے
کے ساتھ باہمی تعلقات خوشگوار ہو جاتے ہیں۔ رنج و راحت اور خوشی و مسرت میں
ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور باہم امداد و تعاون کرتے ہیں۔ اس
طرح بہت سے کٹھن معاملات بآسانی حل ہو جاتے ہیں۔

۲۔ خدا و رسول کی رضا : ہمسایہ کے ساتھ حسن سلوک سے خدا اور اس کے رسول
کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہے جو اصل مقصد حیات ہے اور انسان کی اخروی
نجات کا موجب ہے۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو یہ پسند ہو
کہ خدا اور اس کا رسول اسے محبت کرے اسے چاہیے کہ وہ پڑوسی کا حق ادا کرے
(مشکوٰۃ)

# ۵۔ استاد و شاگرد

مفہوم : استاد یا معلم کے لغوی معنی پڑھانے، سکھانے اور تعلیم دینے والا ہیں اور
شاگرد یا طالب علم کے معنی پڑھنے، سیکھنے اور تعلیم حاصل کرنے والا ہیں۔ اصطلاح
میں استاد سے مراد وہ شخص ہے جو کسی تعلیمی ادارے میں لوگوں کو تعلیم دیتا ہو اور شاگرد
اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی تعلیمی ادارے میں تعلیم پاتا ہو۔

## اہمیت

تحصیل علم میں استاد اور شاگرد کے رشتہ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ تعلیم حاصل
کرنا چونکہ ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اس لیے ہر شخص یہ فریضہ ادا کرنے کے
لیے کسی نہ کسی استاد کے روبرو زانوئے تلمذ تہ کرتا ہے۔ اگرچہ تعلیم بغیر استاد کے
بھی گھر پر کتابوں کے مطالعے سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن علم ایک نہایت بلند

پایہ چیز ہے اور جو لوگ عالم ہوتے ہیں وہ اس کے صحیح و غلط، نیک و بد اور ہدایت و گمراہی میں تمیز کر سکتے ہیں مطلب یہ ہے کہ استاد سے مشق و تعلیم حاصل کیے بغیر نہ تو انسان صحیح تعلیم حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے فوائد سے مستفید ہو سکتا ہے۔

پھر یہ بات بھی مسلم ہے کہ کتابی علم کا علم نہایت محدود ہوتا ہے اس کے برعکس استاد کی صحبت سے طلبہ شعوری اور لاشعوری طور پر بہت کچھ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانہ میں سیکھی ہوئی عادات اور اخلاق انسان کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے استاد کی عادات و اخلاق اور اس کے علم و فضل کا شاگرد کی زندگی پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے اور طالب علم اپنی زندگی کو بہت حد تک استاد کے نقش قدم پر ڈھال لیتا ہے۔ لہٰذا جس قدر کوئی طالب علم اپنے استاد کے قریب رہنے کی کوشش کرے گا اسی قدر وہ علم کی دولت سے مالا مال ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ حصول تعلیم میں مکتب، کتابیں اور دیگر اشیا ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور اصل اور بنیادی حیثیت استاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات و روابط کو حاصل ہے۔

## استاد کا مقام

استاد چونکہ علم کا سرچشمہ ہوتا ہے اس لیے اسلام نے اس کا مقام نہایت بلند متعین کیا ہے۔ اور اس کی بے حد عزت و تکریم کرنے کی تاکید کی ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے استاد کو حقیقی باپ سے بھی زیادہ مرتبہ دیا ہے چنانچہ آپ کا ارشاد ہے "دنیا میں تمہارے تین باپ ہیں۔ ایک وہ جو تمہاری پیدائش کا باعث ہے۔ دوسرا وہ جس نے اپنی لڑکی کی شادی تمہارے ساتھ کر دی اور تیسرا وہ جس سے تم نے علم حاصل کیا اور ان میں سے بہترین باپ تمہارا استاد ہے۔"

صحابہ کرام اور علمائے سلف کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ

وہ اپنے اساتذہ کا بے حد ادب واحترام کرتے تھے اور کبھی کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے دیتے جو استاد کی طبیعت پر گراں ہوتی۔ صحابہ کرامؓ حضرت اپنے معلم اعظم حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی ادب و احترام کرتے تھے بلکہ آپس میں جس سے کچھ سیکھتے اسے استاد کا درجہ دیتے تھے اور اس کا ادب ملحوظ رکھتے تھے حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھایا میں اس کا غلام ہوں اسے اختیار ہے چاہے مجھے بیچ دے چاہے آزاد کردے اور چاہے غلام بنائے رکھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب میں علم حاصل کرنے کیلئے حضرت زید بن ثابتؓ کے مکان پر حاضر ہوتا اور وہ باہر تشریف نہ رکھتے ہوتے تو میں بلحاظ ادب ان کو آواز نہ دیتا اور نہ ہی اندر جاتا بلکہ ان کے دروازے کی دہلیز پر سر رکھ کر لیٹ جاتا اور ہوا مٹی اور ریت اڑا کر مجھ پر ڈالتی رہتی۔ پھر جب حضرت زیدؓ باہر تشریف لاتے اور مجھے اس حالت میں دیکھتے تو نہایت افسوس سے فرماتے اے ابن عم رسولؐ مجھے اطلاع کیوں نہ کرادی؟ اور میں عرض کرتا کہ میرے لیے یہ لازم نہ تھا کہ میں آپ کو اطلاع کراتا۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کی مثال اس بارے میں قابل تقلید ہے آپ فرماتے ہیں کہ میرے استاد حماد جب تک زندہ رہے میں نے ان کے مکان کی طرف کبھی پاؤں بھی نہیں پھیلائے۔

## استاد کے حقوق

استاد کے حقوق سے مراد وہ مراعات ہیں جو کسی استاد کو اپنے طلباء اور معاشرے کی جانب سے حاصل ہوں۔ اسلامی معاشرے کے لیے لازمی ہے کہ استاد کے حقوق کی نگہداشت کرے تاکہ وہ امن و سکون سے اپنے فرائض کو انجام دے اور معاشرے

کے لیے مفید افراد پیدا کرے استاد کے بہت سے حقوق ہیں جن میں سے چند اہم یہ ہیں۔

۱۔ <u>معاشرتی وقار</u>: استاد کا اولین حق یہ ہے کہ معاشرے میں اسے عزت و وقار حاصل ہو اور ہر جگہ اس کی عزت و تکریم کی جائے اسے معاشرے کا ایک اہم فرد تصور کیا جائے اسے اہم قومی و ملکی معاملات میں اس سے مشورہ حاصل کیا جائے اور زندگی کے کسی شعبہ میں اسے نظر انداز نہ کیا جائے اس طرح اسے اپنے مرتبہ و مقام کا احساس ہوگا اور وہ نہایت محنت و جانفشانی سے تعمیر معاشرہ میں مصروف رہے گا مزید فائدہ یہ ہوگا کہ لائق و ذہین افراد تدریس کی طرف مائل ہوں گے اور قوم کو نہایت قابل و لائق اساتذہ کی خدمات حاصل ہوں گی نتیجتاً معاشرے کا تعلیمی معیار بلند ہوگا اور قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہوگی۔

۲۔ <u>روزگار سے بے فکری</u>: استاد کا دوسرا حق یہ ہے کہ وہ روزگار کی جدوجہد اور فکر معاش سے آزاد ہو اسکی تنخواہ یا وظیفہ اتنا ہو کہ اس کی تمام ضروریات کی تکمیل ہو اور وہ آسانی گزر اوقات کر سکے۔ تاکہ وہ مکمل ذہنی امن و سکون سے اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لا کر اپنے تدریسی فرائض کو سرانجام دے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر استاد کا ذہن فکر معاش میں مصروف رہے گا تو وہ کبھی بھی اپنے فرائض تحقیقی یا تدریسی ذمہ داریوں سے بااحسن طریق عہدہ برآ نہیں ہو سکے گا۔ بجز استاد اپنی معاشی پستی و بدحالی کی بنا پر نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جس سے اس کی ذہنی و دماغی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ اساتذہ کی آمدن اس قدر معقول ہو کہ وہ باعزت زندگی بسر کر سکے

۳۔ <u>ادب و احترام</u>: استاد کا ایک حق یہ بھی ہے کہ طلبہ اس کی ہر طرح سے عزت و تعظیم کریں اور ہر موقع و محل پر اس سے ادب و احترام کے ساتھ پیش آئیں۔ استاد کو اپنا روحانی

باپ کبیر اور حقیقی باپ کی طرح اس کی اطاعت و فرمانبرداری کریں اور کبھی بھولے سے بھی اخلاقی بداخلاقی اور گستاخی کے مرتکب نہ ہوں۔ اس طرح استاد بھی نہایت محبت و شفقت اور محنت و جانفشانی سے تعلیم دے گا۔

## استاد کے فرائض

استاد کے فرائض سے مراد وہ ذمہ داریاں ہیں جو ایک استاد پہ اپنے طلبہ و معاشرے کے لیے لازم آتی ہیں۔ استاد کے فرائض کا دائرہ نہایت وسیع ہے تاہم ضروری فرائض حسب ذیل ہیں۔

۱۔ <u>اخلاق حمیدہ</u> :۔ استاد کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اخلاق حمیدہ کا حامل بنائے اور اپنے نفس کو ہر قسم کی بد اخلاقی سے بچائے رکھے۔ امانت و دیانت، صداقت و اعتبار، محبت و شفقت، وقار و متانت، فیاضی و فراخدلی، صبر و قناعت اور حق گوئی و بیباکی وغیرہ تمام صفات حسنہ اس میں ہونی چاہئیں اور بغض و حسد، فریب، غیبت و چغل خوری، حرص و ہوس، بخل و خود پسندی، نمائش و ریاکاری اور لغو و بیہودہ گوئی جیسی عادات قبیحہ سے اسے اپنا دامن پاک و صاف رکھنا چاہیے۔ استاد کو ہمیشہ خودی و خودداری کی زندگی بسر کرنی چاہئے۔ اور انتہائی تنگ حالی میں بھی اپنے آپ کو ذلیل و رسوا نہ ہونے دینا چاہئے۔ طلبہ سے ہمیشہ نرمی، تحمل اور شفقت سے پیش آنا چاہیے۔ ان کی مشکلات کو حل کرنے پر آمادہ رہنا چاہئے اور ان کی غلطیوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہر ایک سے خوش خلقی سے پیش آنا چاہیے۔ نہایت سلیقہ سے گفتگو کرنی چاہیے اور بیہودہ گوئی اور بدزبانی سے اجتناب کرنا چاہئے۔ مختصر یہ کہ استاد کو شستہ اطوار، محمودہ اخلاق اور نفیس مذاق کا حامل ہونا چاہیے۔

۲۔ <u>احساس ذمہ داری</u> :۔ استاد کا دوسرا فرض یہ ہے کہ اسے اپنی ذمہ داریوں

کا پوری طرح سے احساس ہو۔ اسے اس بات کا بھی احساس ہونا چاہئے کہ قوم کے نونہالوں کی تعلیم کا مقدس فریضہ اسے سونپا گیا ہے اور قوم کی آئندہ ترقی و عروج کا انحصار اسی کی کوششوں و کاوشوں پر ہے۔ اس بارے میں اس کی معمولی کوتاہی بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے اور قوم کو ہمیشہ کیلئے پستی و پسماندگی میں دھکیل سکتی ہے۔ درحقیقت ذمہ داری کا احساس ہی استاد کو محنت و صحیح رہنمائی پہ آمادہ کرتا ہے اور وہ پوری لگن و دل جمعی کے ساتھ اپنے آپ کو قوم کی تعمیر میں مصروف کر دیتا ہے لہٰذا استاد کو اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس ہونا چاہیے۔ وقت کا پابند ہو۔ محنت و جانفشانی سے صحیح معلومات بہم پہنچائے۔ طلبہ کی اخلاقی تربیت کا بھی خیال رکھے اور نہایت خلوص سے اپنے فرائض سرانجام دے۔

۳۔ مطالعہ: استاد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنا مطالعہ ہمیشہ جاری رکھے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتا رہے جو مضمون بھی وہ پڑھاتے اس پر اسے مکمل عبور حاصل ہونا چاہیے کیونکہ اگر وہ خود کسی چیز کو اچھی طرح سمجھ نہ سکے گا تو طلبہ کو کیا سمجھا سکے گا۔ کم علم اور آسائش پسند اساتذہ نہ تو کبھی طلبہ میں مقبول ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ان سے اپنا احترام کروا سکتے ہیں۔ لہٰذا استاد کے لیے ضروری ہے کہ مطالعہ و تحقیق میں مصروف رہ کر اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے۔ حضرت سعید بن جبیر رح فرماتے ہیں کہ عالم اسی وقت تک عالم رہ سکتا ہے جب تک وہ طالب علم ہے۔ جب وہ پڑھنا چھوڑ دے اور سمجھے کہ وہ علم سے بے نیاز ہو گیا ہے اور جو کچھ اس نے حاصل کر لیا ہے وہ اس کیلئے کافی ہے تو ایسا سمجھنے والا سب سے بڑا جاہل ہے۔

۴۔ طلبہ سے شفقت و ہمدردی: استاد کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں سے غیر معمولی شفقت و ہمدردی سے پیش آئے اور ان سے مساویانہ سلوک روا رکھے۔ استاد کو ایک روحانی باپ کی حیثیت سے شاگردوں کے ساتھ نہایت

مشفقانہ برتاؤ کرنا چاہیئے۔ ان کے مسائل میں دلچسپی لینی چاہیئے۔ اور انہیں حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر کوئی شاگرد غریب و نادار ہو تو اس کی مالی امداد کا انتظام کیا جائے اور اگر کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کی جائے۔

اس ضمن میں یہ بات مدنظر رہنی چاہیئے کہ سب طلباء سے مساویانہ سلوک کیا جائے امیر و غریب اعلیٰ و ادنیٰ سب قسم کے طلبہ سے یکساں برتاؤ کیا جائے۔ اسی طرح طلبہ ذہین بھی ہوتے ہیں اور کند ذہن بھی۔ استاد کو چاہیئے کہ وہ کسی طرح کے طلبہ کی طرف بے توجہ نہ رہے اور کند ذہن و غبی کو نفرت و حقارت سے نہ دیکھے بلکہ ہمدردی و شفقت سے پیش آئے۔

۵۔ __طلبہ کے کردار کی تشکیل__ — استاد کا فقط یہی فرض نہیں کہ وہ طلباء کو علم سے فیض دے بلکہ صحیح استاد وہ ہے جو تعلیم کے ساتھ اپنے طلبہ کو اخلاقی تربیت بھی دیتا ہے اور ان کی سیرت و کردار کی تشکیل بھی کرتا ہے۔ استاد کو چاہیئے کہ وہ طلبہ کے اخلاق پر نظر رکھے اور تعلیم کے دوران گاہے بگاہے ان کی اخلاقی کمزوریاں اشارتاً ان پر واضح کرتا رہے اور عمدہ اخلاق اور نیک اعمال کی طرف ان کو ترغیب دلاتا رہے۔ اس طرح تعلیم کا اصل مدعا حاصل ہوتا ہے اور طلبہ عالم باعمل بن کر فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔

۶۔ __پابند شریعت__ — استاد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ پابند شریعت ہو۔ دل میں خوف خدا رکھتا ہو اور دین و شریعت کے تمام احکام اچھی طرح بجا لاتا ہے۔ اس کے تمام اعمال و اقوال اور حرکات و سکنات سے تقویٰ و پرہیزگاری عیاں ہوتی ہو۔ اور وہ فرائض پنجگانہ پوری طرح ادا کرتا ہو اور دوسروں کو بھی برائی سے بچنے اور نیکی کرنے کی ترغیب دیتا ہو۔

۷۔ __قول و عمل میں مطابقت__ — استاد کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ اپنے

قول و عمل میں مطابقت پیدا کرے ۔ جو بات زبان سے کہے اور جس بات کی دوسروں کو تعلیم دے خود بھی اس پر عمل پیرا ہو ۔ کیونکہ اگر وہ خود عمل نہیں کرے گا تو اس کا قول بے اثر ہوگا اور بات بے نتیجہ ثابت ہوگی ۔ قرآن پاک میں بھی قول و عمل میں مطابقت کی تلقین کی گئی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ۔

لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ — جس چیز پر تم خود عمل نہیں کرتے وہ کہتے کیوں ہو ۔؟

جن لوگوں کے قول و عمل میں مطابقت نہیں انہیں آخرت میں سخت عذاب دیا جائے گا ۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے لیے تشریف لے گئے تو آپ کا گزر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے ۔ آپ کو بتایا گیا کہ یہ آپ کی امت کے وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو اچھی باتوں کی تلقین کرتے تھے مگر خود ان پر عمل نہیں کرتے تھے ۔ استاد چونکہ دوسروں کے لیے نمونہ اور مثال ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ جس بات کی تلقین کرے پہلے خود اپنے آپ کو اس کا عامل بنائے ۔

**۷۔ اشاعت تعلیم :** استاد کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ علم کی اشاعت کرے ۔ طلبہ کا فریضہ محض علم حاصل کر کے اپنے تک محدود رکھنے سے ادا نہیں ہو جاتا بلکہ طلب علم کے بعد علم کی اشاعت بھی اسی طرح فرض ہے ۔ حضور اکرم کا ارشاد ہے کہ ضروری علم اور قرآن سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ ۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش رکھے گا جس نے میری باتیں سنیں ، انہیں یاد رکھا اور انہیں نشر کیا ۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ کسی سے علم کے بارے میں کوئی بات پوچھی جائے تو وہ جانتے ہوئے بھی نہ بتائے تو قیامت کے روز اسے آگ کی لگام دی جائے گی ۔

# شاگرد کے حقوق

شاگرد کے حقوق سے مراد وہ مراعات ہیں جو ایک طالب علم کو معاشرہ اور استاد کی جانب سے حاصل ہوں۔ شاگرد کے حقوق کو ذیل کے عنوانات کے تحت واضح کیا جا سکتا ہے :-

۱- تحصیل علم کی سہولتیں :- شاگرد کا اولین حق یہ ہے کہ تحصیل علم کیلئے اسے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ درس گاہ کے لیے ایک روشن و ہوادار عمارت ہونی چاہیے۔ ہر مضمون کے ماہر اور لائق و قابل اساتذہ کا خاطر خواہ انتظام ہو۔ مکتب سے ملحق ایک وسیع کتب خانہ بھی ہونا چاہیئے جس میں ہر موضوع پر عمدہ عمدہ کتابیں ہوں۔ پھر دور دراز سے آنے والے طلبہ کے لیے اقامت گاہ ہونی چاہیے جس میں رہائش کے علاوہ خورونوش کا بھی انتظام ہو۔ غریب و نادار طلبہ کو وظائف اور مالی رعائتیں دی جائیں اور لائق و محنتی طلبہ کی انعامات و اکرامات سے حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ غرضیکہ تعلیم حاصل کرنے والوں کو ہر ممکن سہولتیں حاصل ہونی چاہئیں۔

۲- صحت و تندرستی :- شاگرد کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اس کی جسمانی صحت و تندرستی کا خیال رکھا جائے اس مقصد کے لیے مکتب سے ملحق کھیل کا میدان ہونا چاہیئے جہاں ہر طرح کی کھیلوں اور ورزشوں کیلئے سہولتیں میسر ہوں تاکہ طلبہ اپنی صحت کو برقرار رکھ سکیں۔ پھر مکتب کے ساتھ شفاخانے کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ گاہے بگاہے طلبہ کی صحت کا معائنہ کیا جا سکے اور بوقت ضرورت علیل و بیمار طلبہ کا علاج معالجہ کیا جا سکے۔

۳- اخلاقی تربیت :- شاگرد کا فقط یہی حق نہیں کہ اسے علم سکھایا جائے بلکہ اس کی اخلاقی تربیت بھی اس کے حقوق میں شامل ہے علم تو گھر پر بھی کتابوں سے اخذ کیا جا

سکتا ہے لیکن استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کا مقصد علم کے ساتھ اخلاقی تربیت کا حصول بھی ہے۔ استاد کو چاہیے کہ اپنے قول و فعل سے شاگرد کو اخلاق حمیدہ سکھائے اور اس کی سیرت و کردار کی اعلیٰ پیمانے پر تشکیل کرے۔

## شاگرد کے فرائض

شاگرد کے فرائض سے مراد وہ ذمہ داریاں ہیں جو کسی شاگرد پر استاد و معاشرے کے لیے لازم آتی ہیں۔ شاگرد کے فرائض حسب ذیل ہیں۔

۱۔ علم کی لگن:۔ شاگرد کا اولین فرض یہ ہے کہ اپنے اندر علم کی لگن و پیاس پیدا کرے کیونکہ اس کے بغیر علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ تحصیل علم کے دوران طالبعلم کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے اگر اس میں علم حاصل کرنے کا سچا جذبہ اور جوش و ولولہ نہ ہو گا تو وہ ہمت ہار بیٹھے گا۔ تحصیل علم کیلئے بعض اوقات طویل سفر اور فقر و فاقہ تک کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایسے موقعوں پر علم سے دلچسپی اور ذوق و شوق کا نہ ہونا تحصیل علم میں زبردست رکاوٹ بنتا ہے۔

علمائے سلف میں تحصیل علم کی اس قدر لگن تھی کہ انہوں نے اس راستے میں دور دراز ممالک کا سفر کیا اور کئی کئی دن کا فاقہ برداشت کرنا ضروری قرار دے دیا چنانچہ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ "کوئی شخص علم و دانش کے مرتبہ پر اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک کہ اس پر فقر و فاقہ کی مار نہ پڑے اور ایسے وہ ہر چیز پر ترجیح نہ دے"۔ امام شعبیؒ سے پوچھا گیا کہ انہیں علم کیونکر حاصل ہوا۔ تو فرمایا "اپنے اوپر اعتماد نہ کر لے۔ علم کے لیے سفر کرتے۔ گدھے کی طرح صبر کرتے۔ اور کوے کی طرح صبح سویرے اٹھتے تھے"۔

علم کی لگن سے حاصل ہونی چاہیے کہ علمی نکات بلا تمیز جس سے بھی ملے حاصل کرے
اپنے سے کم تر یا کم عمر سے علم حاصل کرنے میں عار محسوس نہ کرے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
اپنے استاد امام مالک رحمۃ سے تیرہ سال بڑے تھے لیکن ان کے سامنے اس طرح بیٹھتے
جس طرح کوئی بچہ شفیق باپ کے سامنے بیٹھتا ہے۔

۲۔ استاد کا ادب و احترام۔ شاگرد کا ایک اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے استاد کا
حد درجہ ادب و احترام کرے۔ اس کی پوری پوری اطاعت و فرمانبرداری بجا
لائے۔ نافرمانی، گستاخی اور بے رخی یا کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے
استاد کو تکلیف یا کوفت پہنچے۔ اگر کسی وقت وہ سخت الفاظ کہہ دے تو
محسوس نہ کرے کیونکہ استاد کا ہر اشارہ شاگرد کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔ استاد کی
عزت و تکریم بالکل اسی طرح کرنی چاہیے جس طرح حقیقی باپ کی عزت کی جاتی ہے
حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اپنے استاد حضرت زید بن ثابت رضی کی رکاب پکڑ کر چلتے
تھے اور فرماتے تھے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنے علماء کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں

۳۔ علم کا احترام۔ شاگرد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ استاد کے علاوہ علم کا بھی
احترام کرے کیونکہ علم کے تعظیم کیے بغیر علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ صرف یہی نہیں
بلکہ شاگرد سے کوئی فعل بھی ایسا سرزد نہ ہونا چاہیے جس سے علم کے احترام کو صدمہ
پہنچتا ہو۔ کتابوں کو نہایت سلیقے و قرینے اور ادب و احترام سے رکھنا چاہیے
اور علم حاصل کرنے کے لیے علم کے مقام تک خود پہنچنا چاہیے چنانچہ امام زہری
کہتے ہیں ”علم کے لیے یہ بھی کسر شان ہے کہ اسے اس کے حاصل کرنے والے
کے گھر پہنچایا جائے۔“

۴۔ احساس فرائض۔ شاگرد کو اپنے تمام فرائض اور ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس
ہونا چاہیے۔ وقت کی پابندی کرے سبق یاد کرے اور جو کام اسے دیا جائے اسے

کوشش کرے۔ اپنے فرائض کی ادائیگی میں غفلت و سستی کا اظہار نہ کرے۔ صرف سبق پڑھنے سے جی نہ چرائے۔

**۵۔ صحت کی حفاظت** :۔ شاگرد کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ اپنی صحت و تندرستی کا بھی خیال رکھے کیونکہ تندرست جسم تندرست دماغ کا پیش خیمہ ہے۔ جسم و دماغ کے بھی کچھ انسان پر حقوق عائد ہوتے ہیں اس لیے ہر وقت انہیں تحصیل علم کی مشقت میں مبتلا نہیں رکھنا چاہیے بلکہ کچھ وقت انہیں آرام بھی مہیا کرنا چاہیے۔ اگر طالب علم ہر وقت کتابی کیڑا بنا رہے گا تو اس کی صحت برباد ہو جائے گی جس کا خمیازہ اسے عمر بھر ادا کرنا پڑے گا۔ لہٰذا طالب علم کو چاہیے کہ وہ تحصیل علم کے ساتھ ساتھ اپنی جسمانی صحت کا بھی خیال رکھے اور کھیل کود سے اس کی چستی قائم رکھے۔

**۶۔ عمدہ سیرت و کردار** ،شاگرد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو عمدہ سیرت و کردار کا حامل بنا لے۔ شریعت کا پابند ہو۔ استاد کے نقش قدم پر چلے۔ اپنے ہم جماعتوں سے پیار و محبت اور خلوص و یگانگت سے رہے اور ہمیشہ اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرے۔ کبھی کسی پر زیادتی نہ کرے۔ شرارت نہ کرے، بیہودہ گوئی یعنی اخلاق رذیلہ کا مرتکب ہو۔ بلکہ ہمیشہ فضائل اخلاق اور بلندی کردار کا ثبوت دے تاکہ اپنے اساتذہ اور مکتب کے لیے عزت و وقار پیدا کرے۔

---

## ۶۔ شہری

**مفہوم** :۔ شہری کے لیے عربی زبان میں "مدنی" اور "حضری" کے الفاظ مستعمل ہیں اور اس کے لغوی معنی شہر کا رہنے والا ہیں لیکن اصطلاح میں اس سے مراد

ہر وہ شخص ہے جو کسی مملکت یا ریاست کا باشندہ ہے خواہ وہ شہر میں رہتا ہو یا قصبہ میں دیہات میں رہتا ہو یا خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتا ہو وہ ہر جگہ شہری تصور ہوگا شہری کیلئے رنگ ونسل اور قوم ومذہب کی بھی کوئی قید نہیں بلکہ ایک مملکت کے تمام باشندے خواہ کسی رنگ، نسل، قوم، اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں شہری کہلاتے ہیں۔ البتہ غیر مسلم شہری کو ذمّی کا نام دیا جاتا ہے۔

## اہمیت

انسانی مدنی الطبع ہے اور اس کی معاشرے کا قیام ناگزیر ہے۔ معاشرتی زندگی کی ابتدا گھر یا خاندان سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد اقارب اور ہمسایہ کے دائروں میں وسیع ہوتے ہوتے "شہری" کے دائرے میں پوری وسعت اختیار کر لیتی ہے۔

شہری کو معاشرے کی تشکیل اور ریاست کے قیام میں نہایت اہم مقام حاصل ہے کیونکہ ریاست یا مملکت کی نہ صرف تشکیل بلکہ کامیابی کا بھی انحصار اچھے شہریوں پر ہوتا ہے۔ شہریوں کے تعاون کے بغیر امور ریاست سرانجام نہیں دیئے جا سکتے شہری اگر حساس، ذی فہم، حقوق و فرائض سے آشنا اور اچھے کردار کے حامل ہوں تو لازماً ایسی ریاست بہترین ہوگی اور اگر شہری نیک سیرت اور اعلیٰ اخلاق کے حامل نہ ہوں تو ریاست بھی اچھی نہیں ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ شہری اور ریاست لازم وملزوم ہیں۔

## شہری کے فرائض

حقوق شہری سے مراد وہ مراعات ہیں جو ایک شخص کو کسی مملکت یا ریاست کا فرد ہونے کی حیثیت سے حاصل ہوں۔

اسلامی ریاست میں شہری کے حقوق کو مندرجہ ذیل شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے
(الف) مذہبی (ب) معاشی (ج) معاشرتی (د) سیاسی

---

## (الف) مذہبی حقوق

**۱۔ آزادی عقیدہ**: اسلام تمام بنی نوع انسان کو مکمل آزادی مذہب و دین عطا کرتا ہے اور ہر ایک کو اختیار دیتا ہے کہ وہ جو نسا عقیدہ یا مذہب چاہے اختیار کرے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ — دین میں کوئی جبر نہیں۔

اسلام رواداری سکھاتا ہے اور دوسرے متضاد مذاہب کا وجود برداشت کرنے کی تعلیم دیتا ہے تاکہ تقابل کا پہلو موجود رہے اور اسلام کی فوقیت و برتری ثابت ہو سکے۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد اہل مدینہ کے ساتھ میثاق مدینہ طے کیا۔ قرار داد میں ایک شق یہ بھی تھی کہ تمام باشندگان کو آزادی حاصل ہو گی۔

اسلامی حکومت نہ تو خود کسی کو تبدیلی عقیدہ و مذہب پر مجبور کر سکتی ہے اور نہ ہی اس کی اجازت [illegible] افراد دوسروں پر اپنے مذہب کیلئے دباؤ ڈال سکیں [illegible] مسلمانوں میں مختلف [illegible] ممالک سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے اپنے نظریات پر قائم رہ سکتے ہیں اور کسی کو اپنا نظریہ یا عقیدہ [illegible] تبلیغ و ترغیب [illegible] لیے ہر شخص [illegible] اپنے عقیدہ و مذہب کی طرف [illegible] دوسروں کو [illegible] کر سکتا ہے بلکہ حکومت غیر مسلموں کو تبلیغ دین کا حق [illegible]

**آزادی عبادت** : عقیدہ و مذہب کی طرح اسلامی ریاست کے ہر شہری کو عبادت کی مکمل آزادی بھی حاصل ہے۔ یعنی ہر شہری جس طرح چاہے اپنے مذہب و عقیدہ کے مطابق عبادات اور مذہبی رسومات کو انجام دے سکتا ہے۔ حکومت یا کسی دوسرے شخص کو اس میں دخل اندازی کا حق حاصل نہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے پیروں کو بھی اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر کی پوری آزادی حاصل ہے اور ان کی تمام عبادت گاہوں، مذہبی مقامات کے تقدس و احترام کو برقرار رکھا جائے گا بلکہ اسلامی حکومت ان کے تحفظ کی بھی ذمہ دار ہے۔ اسی احتیاط کے پیش نظر فتح بیت المقدس کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عیسائیوں کے گرجا میں نماز ادا کرنے سے احتراز کیا مبادا بعد کے لوگ ایسا کرنے سے مسلمان غیر مسلموں کے معبدوں کو مسجدوں میں بدلنے کا جواز پیدا نہ کر لیں۔

# (ب) معاشی حقوق

**۱۔ آمد و خرچ کا حق** : ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ریاست کے تمام معاشی ذرائع سے استفادہ کرے اور اپنی مرضی و منشاء کے مطابق خرچ کرے بشرطیکہ آمد و خرچ دونوں کے ذرائع جائز ہوں۔ مثلاً ڈاکہ، چوری، جوا، رشوت کا دھندہ وغیرہ سے دولت حاصل نہ کی جائے اور زنا، شراب وغیرہ حرام جگہوں پر اسے خرچ نہ کیا جائے۔

حصول معاش کے لیے کسی شخص کو کوئی خاص پیشہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا بلکہ زراعت، تجارت، صنعت و حرفت اور ملازمت وغیرہ میں سب شہریوں کو یکساں مواقع میسر ہوتے ہیں اسی طرح ادنیٰ و اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوتے ہیں اور ہر شخص کو محض اسکی ذاتی اہلیت و صلاحیت کے مطابق ملازمت مہیا کی جاتی ہے۔

۲۔ حق روزگار: اسلامی ریاست کے ہر شہری کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اسے روزگار مہیا کیا جائے۔ ہر شہری کو تعلیم و تربیت کے ذریعے اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنا روزگار خود کما سکے اور ہر ایک کو اس کی استعداد و قابلیت کے مطابق ذریعہ معاش مہیا کیا جائے الغرض کسی شخص کو بیکار نہ رہنے دیا جائے اور اگر کسی کو کام نہ مل سکے تو حکومت اپنے بیت المال سے اس کی بنیادی ضروریات پوری کرے

# (ج) معاشرتی حقوق

۱۔ حق زندگی: اسلامی ریاست کے ہر شہری کو آزاد و پُرامن زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے۔ کسی شخص کو نہ تو غلام بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی قید میں رکھا جا سکتا ہے حتیٰ کہ بغیر اثبات جرم حکومت بھی کسی کو قید میں نہیں ڈال سکتی۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو قتل کر دے تو اسلام قصاص کا مطالبہ کرتا ہے الغرض ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ حکومت اس کی زندگی کی محافظ ہو۔

۲۔ حق عزت و آبرو: معاشرتی اعتبار سے تمام شہری مساوی عزت کے مستحق ہیں اور ہر ایک پر دوسرے کا احترام یکساں لازم آتا ہے۔ اس لیے کوئی شخص کسی دوسرے کو نہ تو گالی دے سکتا ہے۔ نہ ہی اس کی بے عزتی کر سکتا ہے اور نہ ہی بہتان طرازی کر سکتا ہے اور اگر کوئی ایسا کرے تو قانون کی نگاہ میں سزا کا مستوجب ہوتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مسلمان پر ایک دوسرے کی ہتک عزت حرام ہے

۳۔ حق مساوات: اسلامی ریاست کے ہر شہری کو قانون کی نگاہ میں مساوات و برابری حاصل ہے۔ عدالت کے سامنے مسلم و غیر مسلم، آقا و غلام، امیر و غریب کا کوئی تفاوت نہیں سب کیلئے یکساں قانون ہے اور سبھی برابر کی حیثیت رکھتے ہیں خلافت علیؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ حضرت علیؓ کی گمشدہ زرہ ایک یہودی کے پاس دیکھی گئی۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا خلیفۃ المسلمین اور یہودی عدالت میں برابر کھڑے ہوئے عدم شہادت کی

بنا پر فیصلہ حضرت علیؓ کے خلاف دیا گیا لیکن آپ نے بُرا نہ محسوس کیا۔ اس بات سے
یہودی اتنا متاثر ہوا کہ اسلام لے آیا۔ تاریخ اسلام میں اس قسم کی لاتعداد مثالیں
موجود ہیں کہ عدالت کے سامنے شاہ و گدا ایک ہی حیثیت سے پیش ہوتے ۔

۴۔ **حق ملکیت** :۔ ہر شہری کو ریاست میں جائداد رکھنے کا بھی حق حاصل ہے یعنی ہر
شخص اس بات کا مجاز ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جائداد خریدے ، رکھے ، اس سے
استفادہ کرے اور بوقت ضرورت فروخت بھی کرے ۔

ہر شہری کا یہ بھی حق ہے کہ اس کو رہائش کیلئے مکان حاصل ہو۔ اگر کوئی شخص خود
مکان حاصل نہیں کر سکتا تو حکومت کا فرض ہے کہ اس کی رہائش کا انتظام کرے۔ اسی طرح
اگر کسی شخص کا مکان حادثہ وغیرہ سے تباہ ہو جائے تو اس کا متبادل انتظام بھی حکومت
کے ذمہ ہے۔ نیز ہر شخص کی جائداد و مال کا تحفظ کا ذمہ بھی حکومت پر عائد ہوتا ہے

۵۔ **حق معاہدات** :۔ اسلامی ریاست کے ہر شہری کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ
دوسروں کیساتھ باہمی معاملات کے متعلق معاہدے کر سکے۔ باہمی مفاہمت سے دونوں
فریق ان معاہدوں کو منسوخ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ایک معاہدہ توڑنے پر رضامند
نہ ہو تو دوسرے سے اپنا حق طلب کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ پابندی بھی ضروری
ہے کہ کوئی ایسا معاہدہ نہ کیا جائے جو شریعت اسلامیہ یا حکومت کی سالمیت اور مفاد
کے منافی ہو مثلاً غلاموں کی تجارت اغوا اور نشیلی اشیاء کی خرید و فروخت وغیرہ

۶۔ **حق تعلیم** :۔ ہر شہری کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ اسے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم
کے مواقع میسر کیے جائیں ہر شہری کیلئے ابتدائی تعلیم مفت ہونی چاہئے اور ذہین
قابل افراد کیلئے اعلیٰ تعلیم کا بھی معقول انتظام ہونا چاہئے۔ اسلام دینی و دنیاوی
دونوں قسم کی تعلیم کا مطالبہ کرتا ہے اس لئے تعلیمی نصاب ایسا ہونا چاہیے جو
دینی و دنیاوی دونوں قسم کے علوم کا حاوی ہو۔

# (د) سیاسی حقوق

۱۔ حقِ رائے دہی :۔ اسلامی ریاست میں ہر شہری حکومت میں حصہ دار ہوتا ہے۔ اور حکومت کی تشکیل اور انتظام میں رائے دینے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ اسلامی حکومت شوریٰ کے اصول پر قائم ہوتی ہے۔ جس کی تشکیل کے لئے ہر عاقل و بالغ کو رائے دہی کا حق حاصل ہے اور اس معاملہ میں کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔

اسلامی ریاست میں قوانین کے ماخذ کتاب و سنت اور اجتہاد ہیں۔ کتاب و سنت کے احکام تو طے ہیں لیکن اجتہاد کا حق صرف علماء اور فقہا کو حاصل ہے، البتہ بعض عام ضرورتوں اور رسم و رواج کے متعلقہ امور میں عوام کو بھی رائے دینے کا حق حاصل ہے۔

۲۔ حقِ منصب :۔ ہر شہری کو یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ وہ حسب استعداد و قابلیت حکومت کے کسی منصب پر فائز ہو سکے۔ اس میں کسی قسم کا امتیاز روا رکھنا درست نہیں۔ البتہ سربراہِ حکومت کے عہدہ کے لئے مسلمان ہونا شرط ہے۔ باقی عہدوں کے لئے منصب کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے قابلیت کو ملحوظ رکھا جائے۔

۳۔ حقِ محاسبہ :۔ ہر شہری کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ حکومت کے کارناموں کا محاسبہ کرے اور حکومت کے سربراہ اور اس کے مشیروں پر تعمیری تنقید کر سکے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے حکومت اپنے امور کے لئے خدا تعالیٰ بلکہ عوام کے سامنے بھی جواب دہ ہوتی ہے۔

خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اپنے خطبہ خلافت میں عوام کے اس حق کو تسلیم کرتے ہوئے فرمایا کہ "لوگو! اگر میں کتاب و سنت پر عمل کروں تو

میری پیروی کرنا اور اگر اس سے بھٹک جاؤں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں۔" حضرت عمرؓ نے بھی ایک مرتبہ لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "لوگو مجھ پر تمہارے متعدد حقوق ہیں جس کے بارے میں تمہیں مجھ سے بازپرس کرنی چاہیے"۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے مجلس میں بار بار آپ کو ٹوکا۔ دوسرے شخص نے اسے روکنا چاہا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "اسے کہنے دو۔ اگر عوام ہمیں نہ ٹوکیں تو ان کا وجود بیکار ہے۔ اور اگر ہم ان کی نہ سنیں تو ہم بے مصرف ہیں"

حکومت کا محاسبہ کرنے کے لئے ہر شہری کو تحریر و تقریر کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ عوام اخبارات و رسائل کے ذریعے حکومت پر تنقید کر سکتے ہیں۔ اور مشورے دے سکتے ہیں۔ اسی طرح زبانی تنقید و مشورہ کے لئے عوام کے اجتماعات بھی منعقد کئے جا سکتے ہیں۔ اس ضمن یہ بات مدِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ تنقید تعمیری ہو اور اس کا انداز بھی پُرامن ہو۔ فتنہ و فساد اور بدامنی پھیلانا مقصود نہ ہو۔

## فرائضِ شہری

یہ وہ ذمہ داریاں ہیں جو کسی شہری پر ایک ریاست کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے لازم آتی ہیں اسلامی مملکت میں ایک شہری پر حسب ذیل فرائض عائد ہوتے ہیں۔

۱۔ **اطاعت و تعاون**:۔ اسلامی ریاست کے ہر شہری کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ حکومت وقت کی اطاعت کرے اور اس کے ہر معاملے میں تعاون کا ثبوت دے۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

| | |
|---|---|
| أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۔ | اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اور جو تم میں سے حاکم ہو اس کی اطاعت کرو۔ |

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں خدا سے تقویٰ رکھنے کی اور حکومت کا حکم سننے اور بجا لانے کی چاہے کوئی غلام تم پر امیر ہو جائے۔ آپؐ کا یہ بھی فرمان ہے کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

ہر شہری پر لازم ہے کہ وہ حکومت کے تمام قوانین کی بھی پابندی کرے اور ملک میں امن و امان قائم کرنے اور اس کی ترقی و سلامتی کے لئے ہر قسم کے ایثار و قربانی سے دریغ نہ کرے۔ ذمیوں پر یہ بھی لازم ہے کہ انہوں نے حکومت سے جو معاہدات کر رکھے ہوں ان کی پابندی کریں۔

۲۔ **محصولات کی ادائیگی**:۔ اسلامی مملکت میں ہر شہری کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ حکومت کے عائد کردہ محصولات کو باقاعدگی سے ادا کرے بعض محصول مذہبی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً زکوٰۃ، عشر وغیرہ ان کا ادا کرنا خدا اور اس کی خوشنودی کا بھی موجب ہے۔ اس کے علاوہ بعض محصول حکومت نظم و نسق چلانے اور رفاہ عامہ کے کاموں اور دیگر ضروریات کے لئے بھی عائد کر سکتی ہے۔ ایک شہری کے لئے ان تمام محصولات کا برضا و رغبت ادا کرنا ضروری ہے تاکہ حکومت کے کاموں میں خلل واقع نہ ہو۔

۳۔ **خدمت خلق**:۔ ہر شہری کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ملک و قوم کی بے لوث خدمت کرے اور اپنے فارغ اوقات کو عوام کی خدمت میں صرف کرے۔ اپنی جائز ضروریات پورے کرنے کے بعد جو رقم بچے اس میں سے کچھ حصہ خدمت خلق کے کاموں میں خرچ کرے مثلاً سکول، ہسپتال، خیرات خانوں کے قیام میں رقم صرف کرے۔

۴- **فرض شناسی** :- شہری کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ فرض شناس ہو۔ اپنے اور دوسروں کے حقوق و فرائض سے پوری طرح سے آگاہ ہو۔ اپنے پر ہمیشہ دوسروں کے حقوق کو ترجیح دے اور محض حقوق کا طلبگار ہونے کی بجائے فرائض کی انجام دہی پر توجہ دے۔ کیونکہ اسی پہ معاشرے کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔

## اچھے شہری کے اوصاف

اسلامی نقطۂ نظر سے ایک اچھے شہری کے اہم اوصاف حسب ذیل ہیں۔

۱- **نیک سیرت** :- ایک اچھے شہری کے لئے ضروری ہے کہ نیک سیرت، عمدہ صفات اور اعلیٰ اخلاق کا مالک ہو۔ عبادت گزار، متقی و پرہیزگار ہو یا بالفاظ دیگر ایک اچھا انسان ہو۔

۲- **پابند قانون** :- اچھے شہری کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ حکومت کا فرمانبردار ہو اور حکومت کے عائد کردہ احکام و قوانین کی پوری طرح پابندی کرتا ہو۔

۳- **فرض شناسی** :- اچھے شہری کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ فرض شناس ہو۔ اپنے فرائض سمجھتا ہو اور دوسروں کے فرائض کی پابندی کرے۔

۴- **باشعور** :- ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ باشعور ہو اور حکومت کے معاملات میں دلچسپی لیتا ہو اور حکام کو ضروری معاملات میں اپنی تجاویز دے۔

۵- **مبلغ** :- ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کو نیکی کی تبلیغ کرتا ہو۔ برے کاموں سے روکتا ہو۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پہ عمل کرتا ہو۔

۶- **روادار** :- اچھے شہری کے لئے روادار ہونا بھی ضروری ہے یعنی دوسروں کے خیالات اور عقائد وغیرہ کو برداشت کرے اور مخالفین کے اعتراضات تحمل سے سنے اور ملکی مفاد پہ اپنی خواہشات کو قربان کر دے۔

۷۔ محنتی:۔ اچھے شہری کے لئے محنتی ہونا نہایت ضروری ہے۔ یعنی اس میں اپنے ذاتی اور قومی و ملکی امور کو انتہائی محنت و جانفشانی سے انجام دینے کا جذبہ ہونا چاہیئے۔

۸۔ صفائی پسند:۔ اچھے شہری کے لئے ضروری ہے کہ وہ صفائی پسند ہو۔ اور حفظانِ صحت کے اصولوں کا پورا پورا خیال رکھتا ہو۔

۹۔ امن پسند:۔ اچھے شہری کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ امن پسند ہو۔ صلح و صفائی کی زندگی بسر کرتا ہو۔ اور لڑائی، جھگڑا، فساد وغیرہ سے اجتناب کرتا ہو۔

باب ۶

# القرآن

(ربع آخر)

## ترجمہ و تشریح

# القرآن

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی وہ آخری و مکمل کتاب ہے جو اس نے تمام بنی نوع انسان کی ہدایت و رہبری کے لیئے اپنے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی۔

**نزول :** قرآن پاک کی وحی حضرت جبرائیل امینؑ لے کر آتے رہے۔ سب سے پہلے وحی غار حرا میں اتری جبکہ حضور اکرمؐ کی عمر چالیس برس تھی۔ یہ سورۃ علق کی ابتدائی آیات پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد قرآن پاک نجماً نجماً سوا بائیس سال کے عرصے تک نازل ہوتا رہا۔ سب سے آخری سورۃ المائدہ کی وہ آیت تھی جس میں تکمیل دین کا اعلان کیا گیا۔ اس وقت حضورؐ کی عمر ۶۳ برس تھی اور یہ آیت آخری حج کے موقع پر اتری۔ قرآن پاک کا ۳/۲ حصہ مکی آیات کا ہے جو مکی زندگی یا مکہ کے قرب و جوار میں نازل ہوا اور ۳/۱ مدنی آیات کا ہے جو مدنی زندگی یا مدینہ میں اترا۔

**تدوین :** آنحضرتؐ پر جب وحی اترتی تو آپؐ اسے ازبر کر لیتے اور پھر صحابہؓ کو سنا دیتے تھے۔ صحابہؓ میں سے بعض زبانی یاد کر لیتے تھے اور بعض جو کاتبان وحی تھے لکھ لیتے تھے۔ آنحضرتؐ کی زندگی میں پورے کا پورا قرآن پاک نازل ہو چکا تھا۔ حضورؐ اور اکثر صحابہؓ کو مکمل حفظ تھا اور کئی ایک صحابہؓ کے پاس قرآن پاک کا لکھا ہوا مکمل نسخہ موجود نہ تھا کیونکہ اس زمانہ میں لکھنے کی سہولتیں عام نہ تھیں۔ عہد صدیقیؓ میں حفظ قرآن کی مدد سے ان نوشتوں کو ترتیب دے کر قرآن پاک کو مکمل کتاب کی صورت میں مدوّن کیا گیا اور عہد عثمانیؓ میں اس کی تمام دنیائے اسلام میں اشاعت کی گئی۔

حفاظت و اہمیت : قرآن پاک مکمل و محفوظ کتاب ہے اور نازل ہونے سے آج تک بحفاظت چلی آئی ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی کیوں کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود باری تعالیٰ نے لیا ہے۔ فرمایا: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (بیشک ہم نے یہ کتاب نازل کی اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں)۔ قرآن پاک تمام بنی نوع انسان کی ہدایت و رہبری کا ضامن ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ○ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ○ (تو تم کدھر چلے جا رہے ہو؟ یہ تو ایک کتاب نصیحت ہے تمام جہان والوں کے لیے تم میں سے جو کوئی سیدھا راستہ چلنا چاہے)۔

تقسیم : قرآن پاک ۱۱۴ سورتوں پر مشتمل ہے۔ سورتوں کی حیثیت ابواب کی ہے۔ ہر سورۃ میں ایک یا زیادہ رکوع ہیں جو پیراگراف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر رکوع متعدد آیات یعنی جملوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ قرآن پاک کو پڑھنے کی سہولت کے لیے سات منازل اور تیس پاروں میں بھی تقسیم کیا گیا ہے۔ پھر ہر پارہ چار برابر حصوں یا ربعوں میں منقسم ہے۔ قرآن پاک کے آخری ربع میں ۱۸ سورتیں ہیں۔

---

# الفاظ اور معانی

ذیل میں قرآن پاک میں بار بار آنے والے الفاظ کے مطالب دیے جاتے ہیں:-

| الفاظ | معانی | الفاظ | معانی |
|---|---|---|---|
| أ | کیا | فِیْ | میں |
| ب | ساتھ | اِلٰی | طرف، تک |
| س، سَوْفَ | جلد، عنقریب | عَلٰی | پر، اوپر |
| ف | پس، تو، سو، پھر | مِنْ، عَنْ | سے |
| كَ | مانند، جیسے، تو، تیرا | مَنْ | جو |
| ل | لیے | هِمْ، هُمْ | ان |
| و | اور | کُمْ | تم |
| ی | مجھ، میرا | ہٗ، ھَا | اس |
| اَوْ، اَمْ | یا | بِاَنَّ | کیونکہ |
| اِنْ | اگر | هُوَ، هِیَ | وہ |
| اَنْ | کہ | کُلَّ | ہر، سب، تمام |
| اِنَّ، اَنَّ، اِنَّمَا | بیشک | حَتّٰی | یہاں تک |
| لَا | نہیں | کَاَنَّ | گویا |
| مَا | کیا، نہیں، جو | لَنْ | ہرگز نہیں |
| اَلَّذِیْ، اَلَّتِیْ | جو، اس | کَلَّا | کبھی نہیں، ہرگز نہیں |
| نَا، نَحْنُ | ہم | اَنَا | میں |
| اِلَّا، غَیْرَ | مگر، سوائے | هٰذَا | اس، یہ |
| قَدْ | تحقیق ہے | کَانَ | تھا |

# ۱- اَلْقَدْرِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا

اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ ① وَمَآ اَدْرٰىكَ

بیشک ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا۔ اور تمہیں کیا معلوم

مَا لَیْلَۃُ الْقَدْرِ ② لَیْلَۃُ الْقَدْرِ ۙ خَیْرٌ مِّنْ

کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس میں روح

اَلْفِ شَہْرٍ ③ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَۃُ وَالرُّوْحُ

الامین اور فرشتے اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں

فِیْہَا بِاِذْنِ رَبِّہِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ④ سَلٰمٌ

ہر طرح سے سلامتی ہے۔ یہاں تک کہ طلوع

# هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ﴿۵﴾

طلوع ہو جائے

**مشکل الفاظ کے معانی و تشریح:** اَنْزَلْنٰهُ = ہم نے اتارا ۔ لَيْلَةِ = رات، شب ۔ اَلْقَدْرِ = قدر والی، عزت والی ۔ اَدْرٰكَ = تمہیں معلوم، تم جانو ۔ خَيْرٌ = بہتر ۔ اَلْفِ = ہزار ۔ شَهْرٍ = مہینے ۔ تَنَزَّلُ = نازل ہوتے ہیں۔ اترتے ہیں ۔ اَلْمَلٰٓئِكَةُ = فرشتے ۔ اَلرُّوْحُ = روح الامین، جبرائیلؑ ۔ بِاِذْنِ = حکم سے ۔ رَبِّهِمْ = ان کا رب ۔ كُلِّ = ہر، تمام، سب ۔ اَمْرٍ = امور، کام، جانب ۔ سَلٰمٌ = سلامتی، امن ۔

**وجہ تسمیہ:** اس سورۃ کا نفس مضمون لیلۃ القدر یعنی عزت و قدر والی رات ہے اس لیے سورۃ کا نام بھی یہی ہے۔

**سبب نزول:** یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی۔ روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص اتنا عبادت گذار تھا کہ تمام رات قیام کرتا تھا اور دن بھر دشمنانِ دین کے خلاف جہاد کرتا تھا۔ ایک ہزار مہینے یہی کرتا رہا۔ صحابہ کرام رضؓ نے اس کے بارے میں سنا تو فکر مند ہوئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

ایک دوسری روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے چار عابدوں کا ذکر کیا جو اسّی سال تک خدا کی عبادت میں محو رہے اور ایک لمحہ بھی خدا کی نافرمانی نہ کی یعنی حضرت ایوبؑ، حضرت ذکریاؑ، حضرت حزقیلؑ اور حضرت یوشعؑ بن نون۔ اس پر صحابہ کرامؓ فکر مند ہوئے تو جبرئیلؑ یہ سورۃ لے کر نازل ہوئے۔

**تشریح آیات:** اس سورۃ میں لیلۃ القدر کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ اس رات کی پہلی فضیلت یہ ہے کہ اس میں قرآن پاک نازل کیا گیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ نے پورا قرآن حکیم لوح محفوظ سے آسمان اول پر اتارا اور پھر وہاں سے بتدریج آنحضرتؐ پر سوا بائیس سال کے عرصہ میں نازل ہوا۔ قرآن پاک کی پہلی وحی بھی اسی رات میں اتری

اس رات کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حضرت جبرائیل اور دوسرے فرشتے اللہ کے حکم سے رحمتیں لے کر خصوصاً نازل ہوتے ہیں۔ اس طرح اللہ کی رحمت کا فیض عام جاری ہوتا ہے۔ تیسری صفت یہ ہے کہ یہ رات ہر آفت و بلا سے سلامتی کا پیغام ہے۔ اس رات میں نیکوکاروں کے لیے امن رہتا ہے اور شیطانی آفات بے اثر رہتی ہیں۔ لیلۃ القدر کا یہ فیضان رحمت اور پیغام امن و سلامتی تمام رات جاری رہتا ہے۔

اتنے فیوض و برکات والی رات کب آتی ہے اس کا اشارہ پہلی آیت میں ہے کہ اس رات میں قرآن پاک کا نزول ہوا۔ نزول قرآن سے متعلق قرآن پاک میں ایک دوسری جگہ فرمایا شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ (رمضان المبارک کا مہینہ ہے جس میں قرآن پاک اتارا گیا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر رمضان المبارک میں واقع ہے۔ آنحضرتؐ نے بھی فرمایا کہ "رمضان المبارک میں ایک رات ہے جو ہزار مہینے سے افضل ہے"۔ ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رات رمضان کے آخری عشرہ میں واقع ہے۔ ایک اور حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ یہ طاق راتوں میں ہے۔ یعنی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷ یا ۲۹ ویں رات۔ بعض کے نزدیک یہ رات بدل بدل کر آتی ہے لیکن اکثر روایات کے مطابق یہ رمضان المبارک کی ستائیسویں شب ہے اور یہی جمہور کا مسلک ہے آنحضرتؐ اس رات کے ثواب کے لیے رمضان کے پورے آخری عشرہ میں

# ۲- اَلْبَيِّنَة

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ

جو لوگ کافر ہیں اہل کتاب میں سے اور مشرکین وہ (کفر سے)

مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ① رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ

باز آنے والے نہ تھے یہاں تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل آجاتی یعنی اللہ

يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ② وَمَا تَفَرَّقَ

کے رسول جو پاک صحیفے پڑھتے ہیں جن میں مستحکم احکام ہیں۔ اور اہل

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ

کتاب نے اختلاف نہیں کیا مگر واضح دلیل آجانے کے بعد۔ اور ان کو

الْبَيِّنَةُ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ

حکم نہیں دیا گیا تھا مگر یہ کہ وہ خالصتاً اللہ کی عبادت کریں یکسو ہو کر

لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ

اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں یہی سچا دین ہے ۔ بیشک جو لوگ کافر

وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ

ہیں ۔ اہل کتاب میں سے اور مشرک وہ دوزخ کی آگ میں ہوں گے ۔ ہمیشہ

الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ

اسی میں رہیں گے ۔ یہی سب مخلوق سے بدتر ہیں ۔ بیشک جو لوگ

اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے وہ سب

الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۞ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ

مخلوق سے بہتر ہیں ۔ ان کا صلہ ان کے پروردگار کے

رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

پاس ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا

بہتی ہیں ۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ۔ اللہ تعالیٰ ان سے خوش

عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ⑧

ہوا اور وہ اس سے خوش ہوئے یہ اس کے لئے ہے جو اپنے پروردگار سے ڈرتا ہے

مشکل الفاظ کے معانی و تشریح :-

لم یکن = نہ تھے ÷ کفروا = جنہوں نے کفر کیا، کافر ÷ اَھْلُ الْکِتٰبِ اہل کتاب جن پر الہامی کتب نازل ہوئیں، یہود و نصاریٰ وغیرہ ÷ المشرکین مشرک، خدا کے ساتھ شرک کرنے والے ÷ منفکین = باز آنے والے، الگ رہنے والے ÷ تَاْتِیَھُمْ ان کے پاس آئے ÷ اَلْبَیِّنَۃُ = واضح دلیل کھلی دلیل ÷ یَتْلُوْا = وہ پڑھتے ہیں ÷ صُحُفًا = صحیفے، آسمانی کتابیں ÷ کُتُبٌ = لکھے ہوئے (احکام الٰہی) ÷ قَیِّمَۃٌ = مستحکم، مضبوط ÷ تَفَرَّقَ = متفرق ہوئے، اختلاف کیا ÷ اُوْتُوْا = دیئے گئے ÷ جَآءَتْھُمْ ان کے پاس آئی ÷ اُمِرُوْا = حکم دیئے گئے ÷ لِیَعْبُدُوْا = کہ وہ عبادت کریں مُخْلِصِیْنَ = خلوص کے ساتھ ÷ حُنَفَآءَ = یکسو ہو کر ÷ یُقِیْمُوْا = وہ قائم کریں ÷ الصَّلٰوۃَ = نماز ÷ یُؤْتُوْا = ادا کریں ÷ نَارَ = آگ جہنم ÷ خٰلِدِیْنَ = ہمیشہ رہیں گے ÷ اُولٰٓئِکَ = وہی لوگ ÷ شَرُّ = بدترین ÷ اَلْبَرِیَّۃِ = مخلوق ÷ اٰمَنُوْا = وہ ایمان لائے ÷ عَمِلُوْا = انہوں نے عمل کیے الصّٰلِحٰتِ = نیک، درست، اچھے ÷ خَیْرُ = نیکی، بہتر، بھلائی ÷ جَزَآءُ بدلہ، صلہ ÷ عند = اس سے ÷ جَنّٰتُ = باغات بہشت ÷ عَدْنٍ = ہمیشہ رہنے والے ÷ تَجْرِیْ = جاری ہیں، بہتی ہیں ÷ تَحْتِھَا = ان کے نیچے ÷ الْاَنْھٰرُ = نہریں ÷ اَبَدًا = ہمیشہ ÷ رضی = راضی ہوا، خوش ہو ÷ عَنْھُمْ = ان سے ÷ رَضُوْا = وہ خوش ہوئے ÷ لِمَنْ = اس کیلئے جو ÷ خَشِیَ = ڈرا ÷ رَبَّہٗ = اس کا پروردگار ÷

**وجہ تسمیہ:** بعثتِ نبویؐ کفار اور مشرکین کے لیے اتمامِ حجت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے البینہ (یعنی کھلی اور واضح دلیل) کے نام سے موسوم کیا ہے اور اس سورۃ میں اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے لہذا یہی سورۃ کا نام ہوا۔

**سببِ نزول:** یہ سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی۔ کفار اہلِ کتاب بھی مشرکین مکہ کی طرح دین اسلام کے منکر تھے اور ہر طرح اسلام کی مخالفت پر کمربستہ تھے۔ حالانکہ اسلام سابقہ ادیان کی تکمیل تھا لہذا اس سورۃ میں آنحضرتؐ کی بعثت کو کفار و مشرکین کے سامنے بطور ایک واضح دلیل پیش کیا گیا۔

**تشریحِ آیات:** ابتدائی تین آیات میں بعثتِ نبویؐ کا مقصد بیان کیا گیا ہے آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت تمام کفار اور مشرکین سخت جہالت اور گمراہی میں مبتلا تھے لہذا اتمامِ حجت کیلئے حضور اکرمؐ کو آخری و مکمل کتابِ ہدایت قرآن حکیم دے کر بھیجا گیا۔

اگلی آیات میں بتلایا گیا ہے کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) نے دین اسلام سے اختلاف کیا حالانکہ یہ دین اصولی طور پر سابقہ ادیان کے موافق تھا۔ اور انہیں توحید خالص، قیامِ نماز اور ادائے زکوٰۃ کا حکم دیا گیا تھا اور یہی حکم پہلے بھی دیا گیا تھا۔ مگر اہلِ کتاب تو ہمیشہ سے اختلاف کرتے چلے آتے تھے۔

آخری تین آیات میں انسانوں کے اعمال کا انجام بیان ہوا ہے یہود و نصاریٰ ہوں یا مشرکین عرب و عجم جو بھی اللہ و رسولؐ کا کفر کریں گے اور کتاب اللہ کو جھٹلائیں گے وہ قیامت کے دن جہنم کی آگ میں ڈالے جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہ لوگ بدترین مخلوق ہیں۔ اس کے برعکس جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے وہ بہترین مخلوق ہیں ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہوگا اور وہ اللہ سے خوش ہوں گے۔

# ۳ - اَلزِّلْزَال

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ① وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ

جب زمین زلزلے سے ہلا دی جائے گی ۔ اور زمین اپنے بوجھ نکال

اَثْقَالَهَا ② وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ③ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ

ڈالے گی ۔ اور انسان کہے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے ؟ اس روز وہ اپنے حالات

اَخْبَارَهَا ④ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ⑤ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ

بیان کرے گی ۔ کیونکہ تمہارے پروردگار نے اسے حکم دیا ہو گا ۔ اس دن

النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ⑥ فَمَنْ يَّعْمَلْ

لوگ گروہ در گروہ نکلیں گے ۔ تاکہ ان کو ان کے اعمال دکھائیں

مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ⑦ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ

جائیں ۔ پس جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہو گی ۔ وہ اس کو دیکھ لے گا اور

# ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿٨﴾

جس نے ذرّہ بھر برائی کی ہو گی وہ بھی اسے دیکھ لے گا

## مشکل الفاظ کے معانی و تشریح

زُلْزِلَتْ = ہلا دی جائے گی ⁂ اَلْاَرْضُ = زمین ⁂ زِلْزَالَهَا = اپنے زلزلے سے، اپنے بھونچال سے ⁂ اَخْرَجَتِ = نکال پھینکے گی ⁂ اَثْقَالَهَا = اس بوجھ (دفینے اور مردے) ⁂ قَالَ = کہے گا ⁂ مَالَهَا = اسے کیا ہو گیا ⁂ يَوْمَئِذٍ = اس روز، اس دن ⁂ تُحَدِّثُ = بیان کرے گی ⁂ اَخْبَارَهَا = اس کی خبریں، اس کے حالات ⁂ رَبَّكَ = تیرا پروردگار ⁂ اَوْحٰى = وحی کی، حکم کیا ⁂ يَصْدُرُ = نکلیں گے ⁂ اَلنَّاسُ = انسان، لوگ ⁂ اَشْتَاتًا = گروہ در گروہ، الگ الگ، مختلف جماعتوں میں ⁂ لِيُرَوْا = تاکہ دکھائے جائیں ⁂ اعمالھم = ان کے اعمال ⁂ يَعْمَلْ = عمل کیا ہو گا ⁂ مِثْقَالَ = وزن، برابر ⁂ ذَرَّةٍ = ذرا، تھوڑا ⁂ خَيْرٍ = نیکی، بھلائی ⁂ يَّرَهٗ = اس کو دیکھ لے گا ⁂ شَرًّا = برائی ⁂

**وجہ تسمیہ** : اس سورۃ میں قیامت کے شروع ہونے کا ذکر ہے کہ اس روز شدید قسم کا زلزلہ آئے گا جس سے ساری زمین الٹ پلٹ ہو جائے گی۔ اسی مناسبت سے سورۃ کا نام "الزلزال" رکھا گیا۔

**سبب نزول** : اس سورۃ کے شروع میں تین آیات میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کی ابتدا زمین کی شدید جنبش سے ہو گی۔ زمین پر ایک زبردست زلزلہ طاری ہو گا۔ ساری زمین ہل جائے گی اور قیامت تک دفن ہونے والے سب بد

اور دفینے باہر پھینک دیئے جائیں گے ۔ سونا چاندی جواہرات اس طرح پڑے ہوں گے کہ لوگ ان کی طرف نظر بھی اٹھا کر نہ دیکھیں گے ۔ بلکہ افسوس کریں گے کہ اس دولت کی خاطر انہوں نے فلاں فلاں ظلم کیوں کیا ؟ انسان زمین کی اس کیفیت پر حیران و پریشان ہو گا کہ اس پر یہ زبردست زلزلہ کیوں کیوں طاری ہو گیا ۔ ؟

اگلی دو آیات میں بتایا گیا ہے کہ اس روز زمین کو قوت گویائی عطا ہو گی اور تمام لوگوں کے حالات و واقعات بیان کرے گی اور گواہی دے گی کہ فلاں شخص نے فلاں نیکی کی اور فلاں نے فلاں بدی و نافرمانی کی ۔ یہ اس لیے کہ اللہ تو یہ حالات بتانے کا اسے حکم دے گا ۔

آخری دو آیات میں واضح کیا گیا ہے کہ اس روز لوگ اپنے اعمال کے اعتبار سے گروہ در گروہ نکلیں گے نیک نیکوں میں شامل ہوں گے اور بد، بدکاروں میں ہوں گے پھر ان کو ان کے اعمال نامے دیئے جائیں گے ۔ ہر شخص اپنے اعمال دیکھ لے گا جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہو گی وہ بھی اس کے سامنے آجائے گی اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہو گی وہ بھی اسے دکھا دی جائیگی ۔ پھر انہی اعمال کے مطابق انہیں اجر دیا جائیگا

اس بیان کا مدعا یہ ہے کہ انسان برائیوں سے بچے اور نیک اعمال کی طرف توجہ دے ۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ معمولی نیکی کا کوئی صلہ نہ ہو گا اور اس طرح معمولی گناہوں پر کوئی گرفت ہو گی بلکہ ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کا بھی اللہ تعالیٰ اجر دے گا ۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ نیکی کو حقیر نہ جانو اگرچہ کسی مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا ہی کیوں نہ ہو" ۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ وہ گناہوں کو ہلکا نہ سمجھو یہ سب مل کر آدمی کو ہلاک کر ڈالتے ہیں ۔ "

# ۴- اَلْعٰدِيٰت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ

قسم ہے، ان سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی جو ہانپ جاتے ہیں پھر سم مار کر

صُبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ﴿۵﴾

چنگاریاں نکالتے ہیں پھر صبح کے وقت حملہ کرتے ہیں پھر اس میں اڑاتے ہیں پھر اس وقت

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ

(دشمن کی) جماعت میں گھس جاتے ہیں۔ بیشک انسان اپنے رب کیلئے ناشکر گذار ہے۔

لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۭ﴿۸﴾ اَفَلَا

اور بیشک وہ خود اس پر گواہ ہے۔ اور بیشک وہ مال کی سخت محبت رکھتا ہے کیا وہ نہیں جانتا

يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ﴿۹﴾ وَحُصِّلَ مَا فِي

جبکہ کرید جائے گا جو کچھ قبروں میں ہے اور ظاہر کردیا جائیگا جو کچھ سینوں میں ہے! بیشک

الصُّدُورِ ﴿۱۰﴾ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾

ان کا پروردگار اس روز ان سے خوب باخبر ہو گا

## مشکل الفاظ کے معانی و تشریح

وَ = قسم ❖ الْعٰدِيٰتِ = سرپٹ دوڑنے والے (گھوڑے) ❖ ضَبْحًا = ہانپتے ہوئے (گھوڑے) ❖ الْمُوْرِيٰتِ = چنگاریاں نکالنے والے (گھوڑے) ❖ قَدْحًا = سم مار کر ❖ الْمُغِيْرٰتِ حملہ کرنے والے ❖ صُبْحًا = صبح کے وقت ❖ اَثَرْنَ = اڑاتے ہیں، اٹھاتے ہیں ❖ نَقْعًا = گرد و غبار ❖ فَوَسَطْنَ = گھس جاتے ہیں جَمْعًا = جماعت، فوج ❖ لَكَنُوْدٌ = ناشکر گزار، احسان ناشناس ❖ لَشَهِيْدٌ = گواہ، آگاہ ❖ لِحُبِّ الْخَيْرِ = مال کی محبت کیلئے ❖ لَشَدِيْدٌ = پکا، سخت ❖ اَفَلَا = کیا نہیں ❖ يَعْلَمُ = وہ جانتا، وہ سمجھتا ❖ بُعْثِرَ = کریدا جائے گا، نکالا جائے گا ❖ حُصِّلَ = ظاہر کیا جائے گا ❖ الصُّدُوْرِ = سینے، دل ❖ لَخَبِيْرٌ = خوب باخبر ہے، پورا واقف ہے ❖

وجہ تسمیہ : عادیات، سرپٹ دوڑنے والے اور آقا کی مرضی کے مطابق یہاں نثار کرنے والے گھوڑوں کو کہتے ہیں جو صحیح جذبہ شکر گذاری کی علامت ہیں۔ اس صورت میں چونکہ انسان کی ناشکری کا ذکر کرتے ہوئے اسے شکر گذار بننے کی دعوت دی گئی ہے اور ان گھوڑوں کی مثال پیش کی گئی ہے۔ لہذا اس کا نام عادیات رکھا گیا۔

سبب نزول : یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی۔ قریش مکہ شرک و بت

پرستی میں مبتلا تھے اور اللہ کی سخت ناشکر گزاری کے مرتکب ہو رہے تھے جس کا سبب یہ تھا کہ وہ حُبِّ دنیا میں بری طرح گرفتار تھے۔ لہٰذا ان پر حقیقت واضح کرنے اور ان کی اصلاح کے لیے یہ سورت نازل کی گئی۔

تشریح آیات : قرآن حکیم میں جو اللہ تعالیٰ کی قسموں کا ذکر ہوا ہے وہ شہادت اور مضبوط دلیل کے طور پر ہوا ہے۔ اس سورت کے شروع میں ہانپتے ہوئے اور تیز رفتار گھوڑوں کی قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ عربوں میں ایسی قسمیں کھانے کا عام رواج تھا۔ یہاں گھوڑے کو وفا شعاری کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ گھوڑا اپنے مالک کا اس قدر وفادار ہوتا ہے کہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہے حتیٰ کہ جان تک قربان کر دیتا ہے۔

آیات ۶ اور ۷ میں بتلایا گیا ہے کہ انسان اس کے برعکس کتنا ناشکر گزار ہے کہ اپنے رب کو صحیح طور پر پہچانتا بھی نہیں۔ جس رب نے اسے یہ زندگی عطا کی اور اس کی بیشمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ پھر اس خرابی کا سبب یہ بیان ہوا ہے کہ وہ مال و دولت کی شدید ہوس میں مبتلا ہے۔ دولت سمیٹنا ہی اس کی زندگی کا مقصد بن چکا ہے۔ مال کے لیے لفظ خیر استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مال فی نفسہٖ بُری چیز نہیں بلکہ اس کی "شدید ہوس" ہی اصل خرابی ہے۔

آخری تین آیات میں آگاہ کیا گیا ہے کہ دنیا کی مال و زر محض عارضی چیز ہے۔ آخر کار یہ سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے گا اور ہر چیز کی حقیقت سامنے آ جائے گی۔ لہٰذا انسان کو اس روزِ آخر کو نہ بھولنا چاہیے اور ہوسِ زر میں مبتلا نہ ہونا چاہیے بلکہ ہمیشہ خدا کا شکر بجا لاتے رہنا چاہیے۔

# ۵۔ اَلْقَارِعَةُ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

اَلْقَارِعَةُ ﴿١﴾ مَا الْقَارِعَةُ ﴿٢﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ﴿٣﴾ يَوْمَ

وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی کیا ہے؟ اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی کیا ہے؟

يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ﴿٤﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ

اس دن لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہوں گے۔ اور پہاڑ رنگ برنگ کی

كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴿٥﴾ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿٦﴾ فَهُوَ

دھنی ہوئی اون کی طرح ہوں گے۔ پس جس کی نیکیاں بھاری ہوں گی تو وہ

فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٧﴾ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿٨﴾ فَاُمُّهٗ

خوشی کی زندگی میں ہوگا۔ اور جس کے وزن ہلکے ہوں گے تو اس کا ٹھکانہ

هَاوِيَةٌ ﴿٩﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ﴿١٠﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿١١﴾

وہ ہاویہ ہوگا۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ کیا ہے؟ ایک دہکتی ہوئی آگ ہے

## مشکل الفاظ کے معانی و تشریح :-

اَلْقَارِعَۃُ = کھڑکھڑا ڈالنے والی (یعنی قیامت) ؛ اَدْرٰکَ = تم جانو تمہیں معلوم ؛ یَوْمَ = دن، جس ؛ یَکُوْنُ = ہوں گے ؛ اَلْفَرَاشِ پتنگے، پروانے ؛ اَلْمَبْثُوْثِ = بکھرے ہوئے، پریشان ؛ اَلْجِبَالُ پہاڑ ؛ اَلْعِھْنِ = رنگ برنگ اون ؛ اَلْمَنْفُوْشِ = دھنی ہوئی ؛ فَاَمَّا = تو، پس ؛ ثَقُلَتْ = بھاری ہوں گی ؛ مَوَازِیْنُہٗ اس کا وزن ؛ عِیْشَۃٍ = عیش، آرام، زندگی ؛ رَاضِیَۃٍ = خوشی، پسند خَفَّتْ = ہلکے ہوں گے ؛ اُمُّہٗ = اس کا ٹھکانہ ؛ ھَاوِیَۃٌ = جہنم کا ایک طبقہ ؛ -

وجہ تسمیہ : اس سورت میں قیامت کا ذکر ہے - قرآن پاک میں قیامت کے کئی نام آتے ہیں مثلاً حَاقَّۃُ (حق ہونے والی)، غَاشِیَۃُ (چھا جانے والی) وغیرہ - انہی میں ایک اَلْقَارِعَۃُ ہے جو اس سورت کا نام ہے

سبب نزول : یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی - کفار و مشرکین مکہ خدا اور رسول کی مخالفت میں روز بروز بڑھتے جا رہے تھے اور راہِ حق کی طرف نہیں آتے تھے لہٰذا یہ سورۃ نازل ہوئی تاکہ انہیں قیامت کی ہولناکیوں اور جہنم کے عذاب کا نقشہ دکھا کر راہِ حق اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے

تشریح آیات : اس سورۃ میں قیامت کی ہولناکیوں کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے کہ اس دن ساری زمین پر ایک نہایت خوفناک اور پریشان کن، کھڑکھڑاہٹ ہو گی - اس کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر اور مستحکم پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور دھنی ہوئی روئی کی طرح فضا میں اڑتے پھریں گے اور انسانوں کی گھبراہٹ و پریشانی اور خوف و ڈر کا یہ عالم ہو گا کہ

وہ بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہراساں و سراسیمہ پھریں گے

سورۃ کے آخری حصہ میں بتایا گیا کہ اس اقرا القری کے عالم میں صرف وہی لوگ آرام اور چین میں ہوں گے جن کے اعمال اچھے ہوں گے اور جن کے پاس نیکیاں زیادہ ہوں گی اور اس کے برعکس وہ لوگ جن کے نیک اعمال کم ہوں گے اور گناہوں کا بوجھ زیادہ ہوگا وہ جہنم کے اس طبقہ میں ڈالے جائیں گے جسے "ہاویہ" کہتے ہیں اور جو دہکتی ہوئی اور بھڑکتی ہوئی آگ ہوگا۔ اس آگ کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ وہ ہماری اس آگ سے ستر گنا زیادہ تیز ہوگی۔

# ۶ - اَلتَّکَاثُرُ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝۲ كَلَّا

تمہیں کثرت کی خواہش نے غافل کر دیا۔ یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں

سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۳ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۴

ہرگز نہیں کاش تم یقین کے ساتھ جان لیتے۔ تم ضرور جہنم

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ﴿٥﴾ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ

کہ دیکھو گے ۔ پھر تم ضرور اسے یقین کی

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ﴿٧﴾ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ

آنکھ سے دیکھ لو گے ۔ پھر اس دن تم سے

يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ﴿٨﴾

نعمتوں کے متعلق ضرور پوچھا جائیگا۔

مشکل الفاظ کے معانی اور تشریح :-

اَلْهٰكُمُ ۔ تمہیں غافل کر دیا ٭ اَلتَّكَاثُرُ ۔ کثرت کی خواہش، دنیا کی ساز و سامان کی ہوس ٭ زُرْتُمُ ۔ تم نے زیارت کی، تم نے جا دیکھیں، تم دفن ہوئے ٭ الْمَقَابِرَ ۔ قبریں ٭ كَلَّا ۔ ہرگز نہیں، خبردار ٭ سَوْفَ عنقریب، جلد ٭ تَعْلَمُونَ ۔ تمہیں علم ہو جائے گا، تم جان لو گے ٭ عِلْمَ الْيَقِينِ ۔ یقینی علم ٭ لَتَرَوُنَّ ۔ تم ضرور دیکھ لو گے ٭ اَلْجَحِيمَ جہنم، دوزخ ٭ عَيْنَ الْيَقِينِ ۔ یقین کی نظر ٭ لَتُسْـَٔلُنَّ ۔ تم سے ضرور پوچھا جائے گا ٭ اَلنَّعِيمِ ۔ نعمتیں ٭

وجہ تسمیہ : اس سورت کا مرکزی مضمون کثرت کی خواہش اور دنیا کی ساز و سامان کی ہوس ہے کہ اس نے انسانوں کو کس طرح خدا سے غافل کر دیا ہے۔ لہذا اس سورۃ کا نام التکاثر ہوا۔

سببِ نزول : یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی۔ اس وقت مشرکین عرب کثرت

کی خواہش، دنیاوی جاہ و حشمت اور مال و زر کی حرص و ہوس میں اس حد تک مبتلا تھے کہ ایک دوسرے پر ظلم و ستم کرتے تھے اور بے جا فخر و غرور کا اظہار کیا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ انصار کے دو قبائل آپس میں اس حد تک فخر و غرور کرنے لگے کہ ایک کہتا دیکھو ہم میں فلاں شخص کتنا بہادر یا مالدار ہے اس پر دوسرے قبیلے والے اس سے بڑھ کر بیان کرتے پھر دونوں قبیلوں کے لوگ قبرستان جا کر اپنے اپنے مردوں کی قبروں کی طرف اشارہ کر کے فخر و غرور کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل کی اور کثرت ہوس کے انجام سے متنبہ کیا۔

تشریح آیات: اس سورت کی ابتدا میں مال و زر اور جاہ و منصب کی ہوس اور کثرت کی خواہش کو احکام خداوندی سے غافل کر دینے والی چیز قرار دیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ دنیا میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ زندگی کے اصل مقصد کو بھول جاتے ہیں اور عمر بھر دولت اور عہدوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر وہ اپنے فرائض کو نہیں پہچانیں گے اور اللہ کی نعمتوں کا صحیح طور پر استعمال نہیں کریں گے تو مرنے کے بعد تم اس حرص و ہوس اور اعمالِ بد کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھو گے اور تمہیں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے گا۔ پھر اس وقت تم سے اللہ کی دی گئی نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ اس یوم الآخر کا آج ہی احساس کرے کثرت کی ہوس سے بچے اور اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا صحیح استعمال کرے۔

# ۷- اَلْعَصْر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝٢ اِلَّا الَّذِیْنَ

قسم ہے زمانے کی ۔ بیشک انسان خسارے میں ہے ۔ مگر جو لوگ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ

ایمان لائے اور نیک اعمال کئے اور آپس میں ایک دوسرے کو حق

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٣

کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے

مشکل الفاظ کے معانی اور تشریح :-

اَلْعَصْر = عصر کا وقت، زمانہ ؛ خُسْر = خسارہ، نقصان ؛ اٰمَنُوْا = ایمان لائے ؛ عَمِلُوْا = اعمال کیے ؛ اَلصّٰلِحٰت صالح، نیک، درست ؛ تَوَاصَوْا = آپس میں ایک دوسرے کو تلقین یا نصیحت کی -

**وجہ تسمیہ:** اس سورۃ میں عصر یعنی زمانے کو انسانی اعمال کے انجام پر بطور شہادت پیش کیا گیا ہے لہٰذا اس سورۃ کا نام العصر ہوا۔

**سبب نزول:** یہ سورۃ مکہ میں آغاز نبوت کے زمانہ میں نازل ہوئی۔ اس دور میں مسلمان بہت تھوڑے تھے اور انہیں طرح طرح کی مشکلات و مصائب کا سامنا تھا۔ اس لیے ضرورت تھی کہ ان مسلمانوں کو تسلی و تشفی دی جاتی کہ صبر و سکون سے حق کی تبلیغ کرتے رہیں اور بارگاہِ ربی سے کامیابی کے امیدوار رہیں۔ لہٰذا یہ سورت نازل کی گئی۔

**تشریح آیات:** اس سورۃ کے آغاز میں زمانے کی قسم کھا کر بے ثباتی اور تیز روی کی طرف توجہ دلایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جو لوگ زمانے پر بھروسہ کرتے ہیں اور اسی کے پیچھے لگے ہیں وہ گھاٹے میں رہتے ہیں اور جو زمانے کو فانی سمجھ کر آخرت کی فکر کرتے ہیں اور اس کے لیے تیاری کرتے ہیں وہی لوگ کامیاب و کامران ہیں۔

چنانچہ اس سورۃ میں کامیابی کے چار سنہری اصول بیان کیے گئے ہیں:-

(۱) ایمان: پہلا اصول اللہ پر ایمان ہے تاکہ انسان اسی کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرے۔ (۲) اعمال صالح: کامیابی کا دوسرا اصول نیک اعمال ہیں۔ جو دراصل ایمان کی عملی صورت ہیں۔ (۳) تلقین حق: تیسری چیز تلقین حق ہے یعنی خود ایمان لانے اور اس پر عمل کرنے کے بعد دوسروں کو بھی حق کی تبلیغ و تلقین کی جائے۔ اسی میں سب بنی نوع انسان کی فلاح مضمر ہے۔ (۴) تاکید صبر: تبلیغ دین کے سلسلے میں مسلمان کو طرح طرح کی مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہٰذا کامیابی کا چوتھا اصول صبر نہایت اہم ہے یعنی مسلمان ان مصائب کو برداشت کرنے میں صبر و ہمت سے کام لیتا ہے۔

# الهمزة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ﴿١﴾ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ﴿٢﴾

خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے عیب لگانے والے کیلئے جس نے مال جمع کیا

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهٗٓ أَخْلَدَهٗ ﴿٣﴾ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي

اور گن گن کر رکھا ۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس

الْحُطَمَةِ ﴿٤﴾ وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ﴿٥﴾ نَارُ

رہے گا ۔ ہرگز نہیں وہ ضرور "حطمہ" میں ڈالا جائے گا ۔ اور

اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ﴿٦﴾ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْـِٕدَةِ ﴿٧﴾ إِنَّهَا

تو کیا سمجھا کہ "حطمہ" کیا ہے ؟ اللہ کی دہکائی ہوئی ایک آگ ہے جو

عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ﴿٨﴾ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿٩﴾

دلوں تک جا پہنچے گی ۔ بیشک وہ ان پر لمبے لمبے ستونوں میں بند کر دی گئی ہے

مشکل الفاظ کے معانی و تشریح: لِكُلِّ = ہر ایک کے لیے: وَيْلٌ = خرابی، افسوس، ہلاکت
هُمَزَةٍ = طعنہ دینے والا، منہ پر بُرا کہنے والا: لُمَزَةٍ = عیب لگانے والا، عدم موجودگی میں عیب کرنے والا: جَمَعَ = جمع کیا، اکٹھا کیا، سمیٹا: عَدَّدَهُ = گن گن کر رکھا: يَحْسَبُ = وہ گمان کرتا ہے: مَالَهُ = اس کا مال: أَخْلَدَهُ = ہمیشہ رہے گا: لَيُنْبَذَنَّ = وہ ضرور ڈالا جائے گا: الْحُطَمَةِ = توڑنے پھوڑنے والی، جہنم کا ایک طبقہ: الْمُوقَدَةُ = بھڑکائی ہوئی: عَمَدٍ = ستون: مُمَدَّدَةٍ = لمبے لمبے

وجہ تسمیہ: اس سورۃ کا مرکزی مضمون عیب جوئی کرنے والے، طعنہ دینے والے اور ہوس زر میں مبتلا شخص کو اس کے انجام سے آگاہ کرنا ہے۔ لہٰذا اس سورۃ کا نام "الھمزہ" رکھا گیا۔

سببِ نزول: یہ سورۃ مکہ میں آغازِ نبوت میں نازل ہوئی جبکہ کفارِ مکہ، آنحضرت کو تنگ کرتے، طعنے دیتے اور آپؐ پر عیب لگاتے تھے حالانکہ بعثت سے قبل یہی لوگ آپؐ کے مداح تھے۔ لہٰذا ان کفار و مشرکین کو متنبہ کرنے کیلئے یہ سورۃ نازل ہوئی۔

تشریح آیات: اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں تین بڑی خرابیوں میں مبتلا اشخاص کی تباہی و بربادی کا اعلان کیا گیا ہے۔ ایک الھمزہ یعنی طعنہ دینے والا جو شخص کسی کے منہ پر اسے بُرا کہتا ہے۔ اور اس کے عیب نکالتا ہے، دوسرا، لمزہ یعنی پس پشت عیب لگانے والا یعنی چغل خور اور تیسرا مال سمیٹنے اور گن گن کر رکھنے والا یعنی جو شخص اتنا بخیل و کنجوس ہے کہ بابا کا سانپ بنا بیٹھا ہے اور ملک و ملت کی ضرورت کے لیے بھی روپیہ نہیں نکالتا۔

اگلی آیات میں ایسے اشخاص کی تباہی و بربادی کی تفصیل بیان ہوئی ہے کہ یہ لوگ جو دنیاوی مال و عزت پر بے جا فخر و غرور میں مبتلا ہو کر دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ انہیں جہنم کے ایسے حصے میں ڈالا جائے گا جسے "حطمہ" کہا گیا ہے حطمہ ایسی وادی جس میں بھڑکتی ہوئی آگ ہے اور وہ ہر شے کو توڑنے پھوڑنے والی ہے یہ آگ ان لوگوں کو پسلی کی طرح پیس کر رکھ دے گی اور ان کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائیں گی۔ اس جہنم کی آگ کے شعلے اسی تیزی سے بھڑک رہے ہوں گے کہ ان کے سینوں تک چڑھ جائیں گے اور لمبے لمبے ستونوں کی طرح چاروں طرف سے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

# ۔ الفیل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ ؕ ﴿۱﴾ اَلَمۡ

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا

يَجۡعَلۡ كَيۡدَهُمۡ فِىۡ تَضۡلِيۡلٍ ۙ‏ ﴿۲﴾ وَّاَرۡسَلَ عَلَيۡهِمۡ

اللہ نے ان کا داؤ غلط نہیں کر دیا؟ اور غول کے غول

طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۙ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ (٤)

پرندے بھیجے جو ان پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ (٥)

پس انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی مانند کر دیا

**مشکل الفاظ کے معانی و تشریح**

اَلَمْ = کیا نہیں ۔ تَرَ = تو نے دیکھا ۔ كَيْفَ = کیسے ۔ فَعَلَ = کیا ۔ اَصْحٰبِ الْفِيْلِ = ہاتھی والے مراد ابرہہ کا لشکر ۔ يَجْعَلْ = کر دیا ۔ كَيْدَهُمْ = ان کا داؤ یا مکر ۔ تَضْلِيْلٍ = غلط کرنا، اکارت کرنا ۔ اَرْسَلَ = بھیجے ۔ طَيْرًا = پرندے ۔ اَبَابِيْلَ = غول کے غول ۔ تَرْمِيْهِمْ = ان پر پھینکتے یا مارتے تھے ۔ حِجَارَةٍ = پتھر ۔ سِجِّيْلٍ = کنکر، سنگریزے ۔ عَصْفٍ = بھوسہ، بھس ۔ مَاْكُوْلٍ = کھایا ہوا ۔

**وجہ تسمیہ:** اس سورۃ میں یمن کے بادشاہ ابرہہ کے ہاتھیوں کے اس لشکر کی تباہی و بربادی کا ذکر ہوا ہے جو خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کیلئے آیا تھا اور ہاتھی کو عربی زبان میں فیل کہتے ہیں لہذا اس واقعہ کی مناسبت سے اس سورۃ کا نام بھی اَلْفِيْل ہوا۔

**شان نزول:** یہ سورۃ ابتدائی دور رسالت میں نازل ہوئی۔ اس زمانہ میں قریش مکہ خدا اور رسول کے سخت مخالف اور دشمن تھے لہذا انہیں زمانہ جاہلیت کے عبرتناک واقعہ فیل کا حوالہ دے کر انہیں خدا دشمنی کے انجام سے آگاہ کرنا مقصود تھا اس لیے یہ سورۃ نازل ہوئی۔

واقعہ فیل یہ ہے کہ آں حضرتؐ کی پیدائش سے تقریباً پچاس روز قبل یمن کا عیسائی بادشاہ ابرہہ ہاتھیوں کا عظیم لشکر لے کر خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کی نیت سے مکہ پر چڑھ آیا۔ قریش مکہ جو اس گھر کے متولی تھے ان میں اتنی قوت نہ تھی کہ مقابلہ کرتے۔ وہ شہر چھوڑ کر چلے گئے مگر اللہ تعالیٰ کو اپنے گھر کی حفاظت منظور تھی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے غول کے غول بھیج دیئے جنہوں نے کنکریاں ابرہہ کے اس لشکر پر اپنی چونچوں سے پتھر کی کنکریاں اس زور سے برسائیں کہ تمام لشکر تباہ و برباد ہو گیا۔

تشریح آیات: اس سورۃ میں شعائر اللہ کی توہین کرنے والوں کے عبرت ناک انجام کا بیان ہے۔ شعائر اللہ اسلام کے وہ امتیازی نشانات ہیں جو اللہ کی عظمت و جلال کی نشاندہی کرتے ہیں مثلاً خانہ کعبہ، رسول اللہ، قرآن پاک اور نماز وغیرہ ان کی حفاظت ملت اسلامیہ کا اولین فرض ہے اور اللہ بھی ان کا محافظ و نگہبان ہے لشکر ابرہہ جس نے خانہ کعبہ کو مٹانے کا منصوبہ بنایا تھا اس کی تباہی کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے غول بھیج کر اس لشکر کا صفایا کر دیا۔ یہ پرندے اپنی چونچوں اور پنجوں میں پتھر کی نوکدار کنکریاں لے کر نمودار ہوئے اور اس لشکر پر اس زور سے پتھراؤ کیا کہ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ بلکہ اس لشکر کی تباہی کی یہ کیفیت تھی جیسے کھایا ہوا بھوسہ ہو یا اجڑا ہوا کھیت ہو جسے جانور چر گئے ہوں اور محض ڈنٹھل باقی رہ گئے ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی مخالفت اور شعائر اللہ کو نقصان پہنچانے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

---

# ١٠- قُرَيْشٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ① اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ

اس لئے کہ قریش کو مانوس رکھا۔ انہیں سردی اور گرمی کے سفر سے

الصَّيْفِ ② فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ③

مانوس رکھا۔ پس چاہئے کہ وہ اس گھر کے رب کی بندگی کریں

الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۵ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ④

جس نے انہیں بھوک میں کھانا اور خوف میں امن دیا

مشکل الفاظ کے معانی اور تشریح:

اِيْلٰف = مانوس کرنا، الفت ڈالنا، خوگر کرنا ۔ رِحْلَة = سفر ۔ اَلشِّتَآء = سردی ۔ اَلصَّيْف = گرمی ۔ فَلْيَعْبُدُوْا = پس چاہئے کہ وہ عبادت کریں ۔ رَبّ = پروردگار، مالک ۔ هٰذَا = یہ، اس ۔ اَلْبَيْت = گھر ۔ اَطْعَمَهُمْ = ان کو کھانا کھلایا ۔ جُوْع = بھوک

أَمَنَهُم ۔ ان کو امن دیا ۔ خَوْفٍ ۔ ڈر ۔

وجہ تسمیہ : قریش آنحضرتؐ کا قبیلہ تھا اور اس خاندان کے پہلے بزرگ کا نام فہر بن کنانہ اور لقب "قریش" تھا جن سے یہ قبیلہ منسوب ہوا ۔ اس سورۃ میں انہی قریش مکہ کو مخاطب کر کے انہیں ان کے فرض منصبی سے آگاہ کیا گیا ہے ۔ لہٰذا اس کا نام "قریش" ہوا ۔

سبب نزول : یہ سورت بھی مکہ میں آغاز نبوت میں نازل ہوئی ۔ اس کا نزول سورۃ الفیل کے بعد ہی ہوا اور در اصل یہ اسی سورۃ کا تتمہ ہے ۔ سورۃ الفیل میں اللہ تعالیٰ نے قریش پر اپنی نعمت بے کراں کا ذکر کیا تھا لہٰذا اس نعمت کی شکر گزاری کے طور پر انہیں اپنی عبادت کا حکم دینا ضروری تھا اس لیے یہ سورۃ نازل کی گئی ۔

تشریح آیات : ۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے قریش پر اپنے انعامات کا ذکر کرتے ہوئے ان سے شکر گزاری کی توقع کی ہے ۔ قریش پر اللہ تعالیٰ کے تین خصوصی انعامات تھے ۔ ایک یہ کہ قریش کے تجارت ہمیشہ لوگ گرمی سردی ہر موسم میں امن و امان سے تجارتی سفر کرتے تھے اور خوب فائدہ اٹھاتے تھے جبکہ دوسرے لوگ اتنا آسانی یہ سفر نہ کر سکتے تھے ۔ دوسرے یہ کہ قریش کو کھانے پینے کی نعمتیں یا سہولتیں میسر تھیں ، لوگ انہیں نذر و نیاز دے جاتے تھے اور تیسرے یہ کہ انہیں ہر طرح سے امن حاصل تھا اور چور ، ملکو ، راہزن انہیں کچھ نہ کہتے تھے ۔ قریش کی یہ ساری عزت و عظمت اللہ کے اس گھر کی بدولت تھی ۔ لہٰذا ان خصوصی انعامات و نوازشات کے صلہ میں ضروری تھا کہ قریش اللہ کے شکر گزار ہوں اور اس کی عبادت و بندگی بجا لائیں ۔ در اصل قریش کے توسط سے اس سورۃ میں ہر انسان کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں

کے لیے اس کا شکر گزار بنے اور عبادت و بندگی سے اپنی شکر گزاری کا اظہار کرے

## الماعون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ﴿۱﴾ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ

کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی ہے

الْيَتِيْمَ ﴿۲﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۳﴾ فَوَيْلٌ

جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور محتاج کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا

لِّلْمُصَلِّيْنَ ﴿۴﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴿۵﴾

پس ایسے نمازیوں کیلئے خرابی ہے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔

الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ﴿۶﴾ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ﴿۷﴾

جو دکھاوا کرتے ہیں اور عام استعمال کی چیز عاریتاً نہیں دیتے

مشکل الفاظ کے معانی و تشریح :۔

اَرَءَیْتَ ۔ کیا تم نے دیکھا ۔ یُکَذِّبُ ۔ وہ جھٹلاتا ہے ۔ اَلدِّیْنِ جزا و سزا ۔ مراد روزِ جزا ۔ یَدُعُّ ۔ دھکے دیتا ہے ۔ یَحُضُّ ترغیب دیتا ہے ۔ طَعَامِ ۔ کھانا ۔ اَلْمِسْکِیْنِ ۔ محتاج ، حاجت مند وَیْلٌ ۔ خرابی ، افسوس ، ہلاکت ۔ اَلْمُصَلِّیْنَ ۔ نمازی ۔ سَاهُوْنَ غافل ۔ یُرَآءُوْنَ ۔ دکھاوا کرتے ہیں ، ریاکاری کرتے ہیں ۔ یَمْنَعُوْنَ منع کرتے ہیں ، نہیں دیتے ۔ اَلْمَاعُوْنَ ۔ عام استعمال کی چیز ، معمولی برتنے والی چیز ۔

وجہ تسمیہ : اس سورت میں جزا و سزا کو جھٹلانے والے کا کردار بیان کیا ہے اور اس کا سب سے افسوسناک پہلو یہ بتایا ہے کہ وہ ماعون یعنی عام برتنے کی اشیاء دوسروں کو ادھار دینے سے روکتا ہے اس مناسبت سے سورۃ کا یہی نام ہوا ۔

سبب نزول : یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی ۔ اس وقت قریش مکہ جو کعبہ کے متولی تھے ان میں بہت سی خرابیاں آچکی تھیں ۔ انہوں نے حج اور اس کے تمام مناسک بگاڑ رکھے تھے توحید اور غربا پروری کی سنت کو مٹا دیا تھا ۔ نماز کی حقیقت باطل کر دی تھی اور جزا و سزا کے منکر ہو چکے تھے لہذا اصلاح احوال کے لیے یہ سورۃ نازل کی گئی ۔

تشریح آیات : اس سورۃ میں روزِ جزا کو جھٹلانے والے کا کردار بیان کیا گیا ہے اور ایسے شخص کی متعدد علامتیں بیان کی گئی ہیں ۔ اول یہ کہ وہ یتیم کو دھکے دیتا ہے وہ فرد جو سایۂ عاطفت اٹھ جانے سے معاشرے میں بے سہارا رہ جائے ۔ یتیم ہے ۔ ایسے فرد کو شفقت و محبت کی زیادہ ضرورت

ہوتی ہے مگر جزا و سزا کی پرواہ نہ کرنے والا اس پر ظلم و ستم کرتا ہے۔ اس کا حق مارتا ہے اور اسے دھکے دیتا ہے۔

ایسے شخص کی دوسری علامت یہ ہے کہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ مسکین ۔ وہ شخص ہے جو نہایت قلیل آمدنی کی وجہ سے نہایت تنگی سے گزر اوقات کرتا ہے۔ وہ حاجت مند تو ہے مگر عزتِ نفس کی خاطر دوسروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ ایسے شخص کی ضروریات کا خیال رکھنا زیادہ ضروری ہے مگر منکر جزا و سزا اس کی بھی پروا نہیں کرتا۔

اس شخص کی تیسری علامت یہ ہے کہ وہ اپنی نماز میں غفلت برتتا ہے اور صرف دکھاوے کی نماز پڑھتا ہے۔ نماز دین کا رکن اور اولین فریضہ ہے لہٰذا اسے خشوع و خضوع سے پابندی وقت کے ساتھ ادا کیا جانا چاہیے مگر جسے جزا و سزا کی فکر نہیں وہ اس اہم فریضے سے بھی غفلت برتتا ہے۔ اور محض دکھاوے کے لیے نماز ادا کرتا ہے۔

اس شخص کی چوتھی علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اس قدر بخیل و کنجوس ہے کہ عام استعمال کی چیزیں دوسروں کو ادھار دینے سے بھی منع کرتا ہے مثلاً پانی، نمک، دیا سلائی، پنسل حالانکہ یہ اشیاء نہایت معمولی قیمت کی ہوتی ہیں گویا ایسے شخص میں دوسروں کی امداد کا قطعاً کوئی جذبہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ جزا و سزا کے دل سے لاپرواہ ہے۔

مختصراً اس سورۃ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو شخص حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا نہیں کرتا، اپنی نماز میں غفلت اور ریاکاری کا مرتکب ہوتا ہے۔ یتیم و مسکین اور معاشرے کے دیگر ضرورتمند افراد کی امداد نہیں کرتا یہاں تک کہ معمولی برتنے کی چیزیں بھی دوسروں کو نہیں دیتا۔ ایسا شخص دراصل روزِ جزا کو جھٹلا رہا ہے اور اس کے لیے تباہی و بربادی ہے۔

# ۱۔ الکوثر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴿۲﴾

بیشک ہم نے تجھے کوثر عطا کی — پس اپنے رب کیلئے نماز پڑھ اور قربانی کر

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴿۳﴾

بیشک تمہارا دشمن ہی بے نام و نشاں ہوگا

## مشکل الفاظ کے معانی و تشریح :-

اَعْطَيْنٰكَ = ہم نے تجھے عطا کی ۔ اَلْكَوْثَرَ ۔ کثرت، خیر کثیر، حوض کوثر ۔ فَصَلِّ ۔ پس نماز پڑھ ۔ نَحَرَ = قربانی کرنا ۔ شَانِئَكَ ۔ تمہارا دشمن ۔ اَبْتَرْ ۔ دُم کٹا، بے اولاد، بے نام و نشان منقطع النسل

**وجہ تسمیہ** : اس سورۃ میں اس خیر کثیر کا ذکر کیا گیا ہے جو آنحضرتؐ کو عطا ہوا ۔ اس مناسبت سے سورۃ کا نام "الکوثر" ہوا۔

**سببِ نزول** :-

یہ سورۃ ہجرت کے بعد مکہ میں نازل ہوئی ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ کے دو

صاحبزادے حضرت قاسمؓ اور حضرت عبداللہؓ بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے بعض مشرکین اس پر آپ کو (معاذ اللہ) اَبْتَرْ کا طعنہ دیتے تھے یعنی یہ کہتے تھے کہ آنحضرتؐ کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں اس لیے آپؐ کی نسل منقطع ہو گی اور آپؐ کا نام ونشان (معاذ اللہ) مٹ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اس بے بنیاد طعنے کو لغو و فضول قرار دینے کے لئے یہ سورت نازل ہوئی۔

تشریح آیات: اس سورۃ کی پہلی آیات میں اس خیر کثیر کا ذکر ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت نبی کریمؐ کے نام کے سربلندی کے لیے آپؐ کو عطا کیا مفسرین نے "کوثر" کے بہت سے معنی بیان کیئے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد حوض کوثر ہے جو جنت میں واقع ہے جس کا مشروب دودھ سے بھی زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیریں اور مشک سے زیادہ خوشبودار ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے روز اس سے اپنے امتیوں کو سیراب کریں گے بعض نے کوثر سے حکمت مراد لیا ہے جو تمام فیوض و برکات کا مرکز ہے۔ بعض نے قرآن حکیم مراد لیا ہے جو تمام نیکیوں اور برکتوں کا سرچشمہ ہے۔ بعض نے اس سے دین اسلام مراد لیا ہے جس میں سب برکتیں اور رحمتیں شامل ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد امت مسلمہ کی کثرت ہے جو باقی تمام امتوں سے بڑھ کر ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہاں ہر طرح کا خیر کثیر مراد ہے جو آپؐ کو عطا ہوا اور جس کی بدولت آپ کا نام زندہ جاوید رہے گا۔

دوسری آیت میں اس نعمت غیر مترقبہ کے عوض نماز اور قربانی کا حکم دیا گیا ہے۔ دراصل نماز اور قربانی بھی اس امت مسلمہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے خاص انعامات ہیں اور بے شمار فیوض و برکات کے حامل ہیں۔ اگرچہ پچھلی نماز اور قربانی کا حکم دیا گیا تھا مگر انہوں نے ان حدود فرائض کو نظر انداز کر دیا۔

آخری آیت میں آنحضرتؐ کے دشمن کے بے نام ونشان اور منقطع النسل ہونے کی بشارت دی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ آنحضورؐ کی اولاد نرینہ نہ ہونے کے باوجود آپ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مگر آپؐ کے دشمنوں کا نام اولاد نرینہ کے باوجود مٹ جائے گا اور حقیقت میں وہی بے نسل بے اولاد اور بے نام ونشان ہوں گے۔ آنحضرتؐ کی اولاد نرینہ نہیں مگر آپؐ کو وہ سب کچھ حاصل ہوگا جو اولاد نرینہ سے مقصود ہوتا ہے۔ آپؐ کی امت کی کثرت بمنزلہ اولاد کے ہے۔

# ۱۰۹۔ اَلْکٰفِرُوْنَ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ ﴿۱﴾ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲﴾ وَلَآ

آپ کہہ دیجئے کہ اے کافرو! میں بندگی نہیں کرتا جس کی تم بندگی کرتے ہو

اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴿۳﴾ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ﴿۴﴾

اور نہ تم عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جس کی

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ؕ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴿۶﴾

تم بندگی کرنے والے ہو اور نہ تم بندگی کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں، تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین

مشکل الفاظ کے معانی و تشریح :-

قُلْ :- کہہ دیجئے (اے نبی) ؛ یٰٓاَیُّهَا :- اے ؛ اَعْبُدُ :- میں عبادت کرتا ہوں ؛ تَعْبُدُوْنَ :- تم بندگی کرتے ہو ؛ اَنْتُمْ :- تم ؛ عَابِدٌ :- عبادت کرنے والا ؛ عَبَدْتُّمْ :- تم عبادت کرتے ہو ؛ دِيْنِ :- طریقہ، راستہ، شریعت ؛

وجہ تسمیہ : اس سورت میں کفار سے مکمل مقاطعہ کا اعلان کیا گیا ہے اس لئے یہ سورۃ "کافرون" کے نام سے موسوم ہوئی۔

سببِ نزول :- یہ سورت مکی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی جبکہ کفار و مشرکین مکہ آنحضرت کو قبولِ دعوت سے بالکل مایوس کر دیا تھا۔ اور آپ کو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "ایک سال آپ ہمارے معبودانِ باطل کی عبادت کریں تو اگلے سال ہم بھی آپ کے خدا کی عبادت کریں گے"۔ اس موقع پر یہ سورت نازل کی گئی اور آنحضرت کو حکم دیا کہ کفار سے اپنی پوری بیزاری کا اعلان کر دیں۔

تشریح آیات : اس سورت کی ابتداء لفظ قُلْ سے ہوتی ہے یعنی حضور کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ یہ بات زیادہ اہم اور زیادہ قابلِ توجہ ہے اس سورۃ میں بھی ایسی ہی اہم بات یعنی کفار سے مکمل مقاطعہ کا ذکر ہوا ہے۔ آنحضرت کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ کفار و مشرکین مکہ سے قطع تعلق اور براءت کا اعلان کر دیں کیونکہ توحید اور شرک یکجا نہیں رہ سکتے اور دونوں کا اتحاد

نامکن ہے کہ کفار کا طریق بندگی الگ ہے اور مسلمانوں کا طرز عبادت بالکل جدا ہے۔ کفار اپنے معبودان باطل اور بتوں کے سامنے ماتھے ٹیکتے ہیں اور مسلمان صرف خدائے واحد و لاشریک کے سامنے سر نیاز خم کرتے ہیں۔ کفار شرک و بت پرستی کو چھوڑ کر توحید اور اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے بلکہ اپنے گمانوں کے مطابق تمام کی جھوٹی راہ پر چلتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ آں حضرت ان سے اور ان کے معبودوں سے مکمل طور پر علیحدگی اور ناپسندیدگی کا اعلان کر دیں۔

سورۃ کے آخر میں یہ واضح کر دیا گیا کہ کفار کے اعمال ان کے ساتھ ہیں اور حضور کے اعمال آپ کے ساتھ ہیں۔ یعنی کفار و مشرکین کو اب ان کے کفر و شرک کی سزا مل کر رہے گی اور آنحضرت کو اطاعت الٰہی کے صلے میں کامیابی و کامرانی حاصل ہوگی۔

# ۱۱۴۔ اَلنَّصْر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَرَاَيْتَ النَّاسَ

جب اللہ کی مدد آ گئی اور فتح ہو گئی اور تم نے لوگوں کو اللہ

يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ﴿۲﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ

گے دین میں جوق در جوق داخل ہوتے دیکھ لیا۔ پس اپنے رب کی تعریف

رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾

کیساتھ تسبیح بیان کرو اور اس سے بخشش مانگ۔ بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

مشکل الفاظ کے معانی و تشریح

جَاءَ: آگئی، آپہنچی۔ نَصْرُ: مدد۔ اَلْفَتْحُ: فتح، کھولنا۔ رَاَيْتَ: تم نے دیکھ لیا۔ اَلنَّاسُ: لوگ۔ يَدْخُلُوْنَ: وہ داخل ہوتے ہیں۔ دِيْنِ: طریقہ، راستہ، شریعت۔ اَفْوَاجًا: گروہ در گروہ، جوق در جوق۔ فَسَبِّحْ: پس تسبیح کر۔ حَمْدِ: تعریف۔ اِسْتَغْفِرْهُ: اس سے بخشش مانگ۔ تَوَّابًا: توبہ قبول کرنے والا، رحمت کرنے والا۔

وجہ تسمیہ: اس سورۃ میں اسلام کی کامل نصرت و فتح کا ذکر ہوا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کر رکھا تھا اس لیے اس سورۃ کا نام بھی "النصر" ہوا۔

سبب نزول: سورۃ مدینہ میں فتح مکہ سے قبل نازل ہوئی۔ فتح مکہ سے قبل ایک، ایک دو، دو اشخاص اسلام لاتے تھے۔ مکہ کے گرد و نواح کے قبائل قریش کی طرف دیکھ رہے تھے کہ وہ اسلام لائیں تو ہم بھی ان کے پیچھے اسلام قبول کریں۔ چنانچہ اس سورۃ میں فتح مکہ کی پیش گوئی کی گئی اور یہ بتایا گیا کہ یہ اسلام کی کامل فتح ہوگی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوں گے۔

تشریح: اس سورۃ کی پہلی آیت میں فتح مکہ کا ذکر ہوا ہے اور یہ بتایا گیا

ہے کہ اس فتح عظیم کا انحصار اللہ کی نصرت و تائید پر تھا۔ اور یہ اسلام کی کامل فتح و کامیابی تھی۔ دوسری آیت میں اسی کامل فتح کا ایک نتیجہ کا ثبوت دیا گیا ہے کہ اس موقع پر لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ چنانچہ اس موقع پر قریش مکہ اور آس پاس کے تمام قبائل نے اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ تمام دن آنحضرتؐ کے پاس بیعت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا بلکہ عورتوں کی بیعت کا الگ انتظام کرنا پڑا اور حضرت عمرؓ کو اس کام پر مامور کیا گیا۔ گویا اس موقع پر ہر طرف اسلام کی فوجیں ہی فوجیں نظر آرہی تھیں۔ تیسری آیت میں اس فتح عظیم کے شکرانے کے طور پر اللہ کی تسبیح و تحمید اور استغفار کرنیکا حکم ہوا۔

احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سورۃ تمام سورتوں میں سب سے آخر میں نازل ہوئی اور آنحضرتؐ کو اس دنیا سے رخصت ہونے کی خبر دی گئی۔ چنانچہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی اور آنحضرتؐ نے فرمایا کہ مجھے میرے وصال کی خبر دی گئی ہے۔ تو حضرت فاطمہؓ کے آنسو نکل آئے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ کہ اس سورۃ کے نازل ہونے کے بعد حضورؐ عبادت الٰہی میں زیادہ مصروف رہنے لگے۔ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرتؐ اپنی آخری عمر میں ان کلمات کا ورد کرتے تھے۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ (پاک ہے اللہ اپنی سب تعریفوں کے ساتھ میں اللہ سے مغفرت چاہتا ہوں اور اسی سے توبہ مانگتا ہوں) آنحضرتؐ کا استغفار کرنا اور توبہ مانگنا اپنی امت کیلئے تھا۔

# ۱۵- اللّھب

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ ﴿۱﴾ مَآ اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ

ابی لہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ ہلاک ہوا۔ اس کے کام نہ آیا اس کا

وَمَا کَسَبَ ﴿۲﴾ سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَھَبٍ ﴿۳﴾ وَّامْرَاَتُہٗ

مال اور جو اس نے کمایا۔ عنقریب وہ شعلہ مارتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا

حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ ﴿۴﴾ فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ﴿۵﴾

اسکی بیوی بھی جو سر پر ایندھن لئے پھرتی ہے۔ اسکے گلے میں کھجور کی چھال کی رسی ہو گی۔

مشکل الفاظ کے معانی و تشریح: تَبَّتْ = ٹوٹ گئے۔ یَدَآ = دونوں ہاتھ۔ اَبُوْ لَھَبٍ = آنحضرت کا چچا نام عبدالعزیٰ تھا، چہرہ شعلہ کی طرح ہونے کی وجہ سے یہ کنیت مشہور ہوئی۔ تَبَّ = ہلاک ہوا۔ اَغْنٰی = فائدہ دیا، کام آیا۔ کَسَبَ اس نے کمایا۔ سَیَصْلٰی = وہ عنقریب ڈالا

جائے گا۔ نَارًا = آگ ؛ ذَاتَ لَهَبٍ = شعلہ مارتی ہوئی ، بھڑکتی ہوئی ؛ اِمْرَاَتُهٗ = اس کی بیوی ؛ حَمَّالَةَ = اٹھانے والی ؛ اَلْحَطَبِ = ایندھن ، لکڑیاں ؛ جِيْدِهَا = گردن ، گلا ؛ حَبْلٌ = رسی ؛ مَّسَدٍ = مونجھ کی چھال ؛

**وجہ تسمیہ** لہب عربی میں بھڑکتی اور شعلہ مارتی ہوئی آگ کو کہتے ہیں۔ ابو لہب آنحضرت کے چچا کی بھی کنیت تھی جو بہت بڑا دشمن اسلام تھا۔ اس سورۃ میں ابو لہب اور دیگر دشمنان اسلام کی تباہی و بربادی اور انہیں شعلہ مارتی ہوئی آگ میں ڈالے جانے کا ذکر ہے۔ اس لئے اس سورۃ کا نام لہب رکھا گیا۔

**سبب نزول** یہ سورۃ مکی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ جب آغاز اسلام میں آنحضرت نے کوہ صفا پر چڑھ کر اپنے عزیز و اقارب کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا کہ میری بات مانو میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس پر ابو لہب بہت برہم ہوا اور حضور سے کہنے لگا تم ہلاک ہو۔ کیا تم نے ہمیں اسی لئے بلایا تھا؟ ابو لہب کی اس درشت کلامی کے باوجود آنحضرت اسے اور دیگر اعدائے اسلام کو نہایت نرمی اور حکمت سے دعوت حق دیتے رہے۔ مگر یہ لوگ اور خصوصاً ابو لہب آپ کی مخالفت میں حد سے بڑھ گئے۔ آپ جدھر جاتے راستے میں کانٹے بچھائے جاتے، آپ پر کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا اور آپ کو برا بھلا کہا جاتا تھا۔ جب ابو لہب اور اس کے ساتھیوں کی عداوت انتہا کو پہنچ گئی اور اتمام حجت کا فریضہ ادا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرما کر ابو لہب کے ساتھیوں کی ہلاکت اور خوفناک تباہی کی پیش گوئی کی۔

**تفسیر کی آیات** اس سورۃ میں ابو لہب اور اس کی بیوی کی ہلاکت و تباہی کی پیشگوئی کی گئی ہے۔ ابو لہب کے خاص طور پر ذکر کی وجہ یہ تھی کہ یہ اپنے قبیلے کا بااثر اور دولتمند شخص تھا۔ اور لوگوں کو راہ حق سے گمراہ کر رہا تھا۔ انبیاء کی دعوت کا ہمیشہ سے یہ طریق کار رہا ہے کہ وہ اپنی دعوت کی ابتداء اور بااثر لوگوں سے ہی کرتے ہیں تاکہ ان کی اصلاح سے عوام کی اصلاح

ہو۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے نمرود کو دعوت دی اور حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو مخاطب کر کے دعوت حق کا آغاز کیا۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ نے بھی آغاز دعوت میں ابولہب اور اس کے درجے کے لوگوں کو خطاب کیا پھر اور سرداران قبائل کو تبلیغ اسلام کے دعوت نامے بھیجے۔

ابولہب کی ہلاکت کا واقعہ یوں ہے کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنی جگہ ایک شخص عاص بن ہشام کو خرید کر معرکۂ بدر میں شرکت کے لیے بھیجا۔ مگر ابولہب پھر بھی زندہ نہ بچ سکا۔ اس معرکہ کے ساتویں روز وہ چیچک میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوا۔ اس کے دونوں بیٹوں نے چھوت کے خوف سے اس کی لاش گھر کے ایک کونے میں ہی پڑی رہنے دی حتیٰ کہ اس کا جسم سڑ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے۔ بعد میں اس پر پتھر وغیرہ پھینک کر دبا دیا۔ اس طرح نہ اس کا مال اسے موت سے بچا سکا اور نہ ہی جو اس نے کمایا یعنی اس کی اولاد اس کے کام آ سکی۔ بلکہ وہ عبرتناک طور پر ہلاک ہوا۔ یہ تو دنیا میں اس کی بربادی کا منظر تھا۔ آخرت میں اسے بھڑکتی اور شعلہ مارتی جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا۔

آخری آیات میں ابولہب کی بیوی ام جمیل کی ہلاکت کا ذکر ہوا ہے۔ جو اسلام دشمنی اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ عناد میں اپنے خاوند کے ساتھ برابر شریک تھی۔ وہ قریش کی معزز عورت ہونے کے باوجود جنگل جا کر خاردار لکڑیاں اور کانٹے چن کر لاتی اور آنحضرت ﷺ کے راستے میں بچھا دیتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا انجام یہ بیان کیا کہ اس کے گلے میں رسی کا پھندا پڑنے سے ہلاک ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک روز جبکہ وہ حسب معمول لکڑیاں لا رہی تھی گٹھا سر سے گرا اور مونجھ کی چھال کی رسی جس میں وہ بندھا تھا اس کے گلے میں پھندے کی صورت میں پڑ گئی۔ گٹھڑ گلے پر لٹک گیا پھندا کھنچ گیا اور وہ ہلاک ہو گئی۔ آخرت میں بھی اپنے خاوند کے ہمراہ جہنم میں جائے گی

میں چونکہ توحید خالص کا بیان ہے۔ اسی لئے اس کا یہ نام ہوا۔
سببِ نزول: یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی۔ روایت ہے کہ مشرکین مکہ نے حضور اکرم سے کہا کہ اپنے رب کے اوصاف بیان کریں۔ اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔
تفسیر و مطالب: اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی توحید خالص کا ذکر ہوا ہے۔ اور اسی سلسلے میں چار بنیادی صفات بیان کی گئی ہیں۔ پہلی صفت اَحَدٌ یعنی اللہ کا ایک ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات میں اکیلا اور تنہا ہے۔ وہی صرف ہمارا اور اس کائنات کا خالق، مالک، رب اور معبود ہے۔ کوئی دوسرا اس کے ساتھ شامل نہیں۔ "اَحَدٌ" کا لفظ صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے اور اسی کو زیب دیتا ہے۔ "واحد" کا لفظ عام ہے۔ اور دوسروں کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

دوسری صفت اَلصَّمَدُ یعنی اللہ کا بے نیاز ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور اسے کسی چیز کی حاجت و ضرورت نہیں اور نہ ہی اسے کسی کی پرواہ ہے بلکہ سب اس کے محتاج ہیں اور اسی سے اپنی حاجتیں طلب کرتے ہیں۔ تیسری صفت لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ کوئی ماں یا باپ ہے۔ وہ خود ہی سب کا خالق ہے اور ہم سب اس کی مخلوق ہیں۔ چوتھی صفت یہ ہے کہ اللہ کا کُفُوًا یعنی برابری و ہمسری کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی شریک ہے اور نہ کوئی ساتھی بلکہ وہ خدا ہے وحدہٗ لاشریک ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔

یہ عقیدۂ توحید دراصل اسلام کی بنیاد ہے اور اسلام کا سارا نظامِ زندگی اسی پر مرتب ہوتا ہے۔ اسے قبول کرنے والا مسلمان ہوتا ہے۔ اور اس کی ساری زندگی خدا کے احکام کے تابع ہوتی ہے۔ اور اسے رد کرنے والا کافر و مشرک

میں مبتلا ہوتا ہے۔ عقیدہ توحید کی اہمیت کے پیش نظر ہی حضور اکرمؐ نے اس صورت کو قرآن پاک کا ایک تہائی قرار دیا ہے۔

## ۱۷۔ اَلْفَلَق

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿۱﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۲﴾

آپ کہہ دیجئے کہ میں پناہ میں آتا ہوں صبح کے رب کی۔ ہر چیز کی بدی سے جو اس نے

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴿۳﴾ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ

پیدا کی۔ اور اندھیرے کی برائی سے جب وہ سمٹ آئے۔ اور ان عورتوں کی برائی

فِی الْعُقَدِ ﴿۴﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾

سے جو گرہوں میں پھونکیں ماریں۔ اور حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے۔

مشکل الفاظ کے معانی و تشریح: اَعُوْذُ = میں پناہ میں آتا ہوں۔ اَلْفَلَق = صبح۔ شَرِّ = برائی۔ خَلَقَ = اس نے پیدا کی

غاسِقٍ = اندھیرا، تاریکی۔ وَقَبَ = چھا جائے۔ النَّفّٰثٰتِ = پھونکنے والیاں۔ حَاسِدٍ = حسد کرنے والا۔

وجہ تسمیہ: اس سورۃ میں جادو ٹونا اور ہر برائی سے رَبِّ الْفَلَقِ یعنی صبح کے رب کی پناہ مانگی گئی ہے۔ اس لئے یہ سورۃ الفلق کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ سورۃ اور اس سے اگلی سورۃ الناس مدینہ میں نازل ہوئی۔

سبب نزول: عرب میں جادو کا بہت رواج تھا۔ خصوصاً یہودی عورتیں عام طور پر جادو کیا کرتی تھیں۔ وہ دھاگوں کے گنڈے بنا کر ان کی گرہوں میں پھونکیں مار کر جادو کرتیں اور بہت سی خرابیاں پیدا کر دیتی تھیں۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ؐ سخت بیمار ہو گئے۔ اور کہا گیا کہ آپؐ پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ چنانچہ اس پر یہ دونوں سورتیں نازل ہوئیں۔

تشریح آیات: انسان دنیا میں طرح طرح کی مشکلات و مصائب میں گھرا ہوا ہے اور اسے کئی قسم کے خطرات کا سامنا رہتا ہے۔ اس لئے اسے اس سورۃ اور اس سے اگلی سورۃ الناس میں ان برائیوں سے بچنے کے لئے رب تعالیٰ کی پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس لئے ان دونوں سورتوں کو معوذتین کہتے ہیں۔

اس سورۃ میں چار چیزوں سے رب تعالیٰ کی پناہ مانگی گئی ہے۔ جو صبح کو پیدا کرنے والا اور تمام عالم سے تاریکی دور کر کے روشنی اور اجالا پھیلانے والا ہے۔ وہ چار چیزیں یہ ہیں۔ پہلا ہر برائی جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی آزمائش کے لئے پیدا کی ہے۔ دوسرے اندھیرے یا تاریکی میں کی جانے والی برائی۔ مثلاً چوری، ڈاکہ، لوٹ مار اور بدکاری جو گناہ اکثر رات کی تاریکی میں سرزد ہوتے ہیں۔ تیسرے جادو سے خصوصاً جو عورتیں گرہوں میں پھونکیں مار کر کرتی ہیں اور

اور چوتھے حاسد کا شر ہے کیونکہ حاسد دوسرے کو پھلتا پھولتا دیکھ کر اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور خود بھی نقصان اٹھاتا ہے۔
یہ چار برائیاں ایسی ہیں کہ انسانیت کو ختم کر دینے والی ہیں۔ لہٰذا ہر مسلمان کو ان سے بچنا چاہیئے اور رب تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

# ۱۸۔ اَلنَّاس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ

آپ کہہ دیجئے کہ میں پناہ میں آتا ہوں لوگوں کے رب کی۔ لوگوں کے بادشاہ کی۔

النَّاسِ ۝ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۥ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِیْ

لوگوں کے معبود کی ہر اس کی برائی سے جو وسوسہ ڈالے اور چھپ جائے۔

یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ

جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے

مشکل الفاظ کے معانی و تشریح: اَلنَّاسِ = انسان، لوگ۔ مَلِكِ = بادشاہ۔ اِلٰهِ = معبود۔ اَلْوَسْوَاسِ = وسوسے ڈالنے والا۔ اَلْخَنَّاسِ = پیچھے ہٹ جانے والا۔ صُدُوْرِ = سینہ، دل۔ اَلْجِنَّةِ = جنات، آگ کی مخلوق جو پوشیدہ رہتی ہے۔

وجہ تسمیہ: اس سورۃ میں مختلف برائیوں سے رب الناس یعنی انسانوں کے رب کی پناہ مانگی گئی ہے۔ لہٰذا اس کا نام سورۃ "الناس" ہوا۔

سبب نزول: یہ سورۃ بھی مدینہ میں سورۃ الفلق کے ساتھ نازل ہوئی اور اس کا سبب نزول بھی وہی ہے جو سورہ الفلق کا ہے۔

تشریح آیات: اس سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ کی تین صفات بیان کر کے مختلف برائیوں سے اس کی پناہ طلب کی گئی ہے۔ وہ صفات یہ ہیں۔ ایک صفت رَبِّ النَّاسِ یعنی انسانوں کا رب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی نوع انسان کا پیدا کرنے والا اور پالنے والا، ترقی و کمال کے مدارج طے کرنے والا ہے۔ دوسری صفت مَلِكِ النَّاسِ یعنی انسانوں کا بادشاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام بنی نوع انسان کا مالک ہے اور حکمران ہے۔ ہم سب اس کی رعایت ہیں۔ ہماری ہر شے اسی کی ہے اور وہی ہمارا مالک و بادشاہ ہے۔ تیسری صفت اِلٰهِ النَّاسِ یعنی انسانوں کا معبود ہے۔ اللہ تعالیٰ جب سب انسانوں کا رب ہے۔ اللہ تعالیٰ جب سب انسانوں کا رب اور مالک ہے تو پھر وہی سب کا معبود بھی ہے۔ ہماری عبادت اور بندگی کا حقدار بھی وہی ہے۔

ان تینوں صفات والے رب کی پناہ ہر اس برائی کے خلاف مانگی گئی ہے جو لوگوں کے دلوں میں چھپ چھپ کر خیالات اور وسوسے ڈالتا

ہے۔ اور بہکاتا اور بہلاتا ہے۔ پھر وہ کھل کر سامنے نہیں آتا بلکہ چھپ کر حملے کرتا ہے۔ دوستی اور خیر خواہی کے پردوں میں انسان کا دین و ایمان لوٹ لیتا ہے۔ پھر ایسا شیطان جنات میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور انسانوں میں بھی۔ اس لئے ہر مسلمان کو ایسے شیطان سے رب تعالیٰ کی پناہ طلب کرنی چاہیئے

# امتحانی سوالات

## ایمان اور کفر

۱۔ ایمان سے کیا مراد ہے؟ اجزائے ایمان کون کون سے ہیں؟ وضاحت کیجئے۔

۲۔ ایمان اور کفر کا فرق بتائیے اور انسانی زندگی پر دونوں کے اثرات بیان کیجئے۔

## ارکان اسلام

۱۔ ارکان اسلام میں شہادت توحید و رسالت کو کیا اہمیت حاصل ہے؟

۲۔ قرآن و سنت کی روشنی میں نماز کی ضرورت و اہمیت پر مضمون تحریر کیجئے۔

۳۔ نماز کے اوقات، رکعتیں اور پڑھنے کا طریق لکھئے۔

۴۔ نماز کے فرائض اور واجبات قلمبند کیجئے۔

۵۔ اسلام میں روزے کو کیا مقام حاصل ہے؟ روزے کے فوائد لکھئے۔

۶۔ زکوٰۃ اور خیرات میں کیا فرق ہے؟ اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت بیان کیجئے۔

۷۔ زکوٰۃ کا نصاب، شرح اور اس کے مصارف بیان کیجئے۔

۸۔ حج کن فیوض و برکات کا حامل ہے؟ حج کی اہمیت بیان کیجئے۔

۹۔ حج کے مناسک اور اس کا طریق ادائیگی قلمبند کیجئے۔

## اخلاق اسلامی

۱۔ اسلامی اخلاق کا مفہوم، اہمیت اور خصوصیات قلمبند کیجئے۔

۲۔ اخلاقِ اسلامی میں "تقویٰ" کی اہمیت پر مضمون تحریر کیجیے۔
۳۔ ہماری عملی زندگی میں "صدق" کو کیا اہمیت حاصل ہے؟ دلائل دیجیے۔
۴۔ قرآن و سنت کی روشنی میں "امانت" کی ضرورت و اہمیت بیان کیجیے۔
۵۔ "صبر" سے کیا مراد ہے؟ صبر کی اہمیت کے دلائل دیجیے۔
۶۔ "تحمل" کسے کہتے ہیں؟ قرآن و احادیث کی روشنی میں تحمل کی اہمیت بتائیے۔
۷۔ "عفو" کا مفہوم بیان کیجیے اور اس کی ضرورت و اہمیت واضح کیجیے۔
۸۔ "عدل" کی اہمیت و افادیت پر سیر حاصل تبصرہ کیجیے۔
۹۔ "احسان" کا کیا مفہوم ہے اور اسے اسلام میں کیا اہمیت حاصل ہے؟ وضاحت کیجیے۔
۱۰۔ "خدمتِ خلق" کی ضرورت و اہمیت پر ایک شذرہ سپردِ قلم کیجیے۔

## اسلامی آدابِ معاشرت

۱۔ قرآن و احادیث کی روشنی میں "سلام" کی ضرورت و اہمیت بیان کیجیے۔
۲۔ اسلامی آدابِ گفتگو احاطۂ تحریر میں لائیے۔
۳۔ قرآن و سنت کی روشنی میں کھانے پینے کے آداب لکھیے۔
۴۔ اسلام نے لباس کے بارے میں جو احکام دیئے ہیں انہیں تحریر میں لائیے۔
۵۔ آدابِ مجلس کے بارے میں اسلام نے کیا ہدایات دی ہیں؟ وضاحت کیجیے۔

## حقوق و فرائض

۱۔ قرآن و سنت کی روشنی میں والدین اور اولاد کے باہمی حقوق و فرائض کا جائزہ لیجیے۔
۲۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حقوقِ اقارب قلمبند کیجیے۔
۳۔ اسلام میں ہمسایہ کو کیا مقام حاصل ہے؟ ہمسایہ کے حقوق تحریر کیجیے۔
۴۔ قرآن و احادیث کی روشنی میں استاد اور شاگرد کے باہمی حقوق و فرائض۔

۵۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے شہری کے حقوق و فرائض بیان کیجیے۔

## القرآن (ربع آخر)

۱۔ مندرجہ ذیل سورتوں کا مکمل ترجمہ کیجیے اور مختصر تشریح بھی کیجیے۔
اَلْقَدْرِ۔ اَلْفِیْلِ۔ قُرَیْشٍ۔ اَلْکٰفِرُوْنَ۔ اَلنَّصْرِ۔ اَللَّهَبِ۔ اَلْفَلَقِ۔ اَلنَّاسِ۔

۲۔ مندرجہ ذیل سورتوں کے مضامین کا خلاصہ تحریر کیجیے۔
اَلْبَیِّنَة۔ اَلزِّلْزَال۔ اَلْعٰدِیٰتِ۔ اَلْقَارِعَة۔ اَلتَّکَاثُر۔ اَلْهُمَزَة۔ اَلْمَاعُوْن۔

۳۔ مندرجہ ذیل الفاظ کا مفہوم وضاحت سے لکھیے۔
وَیْلٌ۔ اَلْمَاعُوْنَ۔ رِحْلَةِ۔ اَلصَّمَدُ۔ اَلْخَنَّاسِ۔ غَاسِقٍ۔ هُمَزَة۔
اَفْوَاجًا۔ کُفُوًا۔ اَلنَّفّٰثٰتِ۔ مُؤْصَدَةٌ۔ لُمَزَة۔ اَلْعَصْرِ۔ مَاْکُوْلٍ
اَلْاَبْتَرُ۔ سِجِّیْلٍ۔ سَاهُوْنَ۔ اَلْحُطَمَةِ۔

۴۔ مندرجہ ذیل میں سے کوئی ایک سورۃ مع ترجمہ خوشخط لکھیے۔
اَلْعَصْر۔ اَلْکَوْثَر۔ اَلْاِخْلَاص۔

۵۔ "مُعَوَّذَتَیْن" سے قرآن پاک کی کونسی سورتیں مراد ہیں؟ ان میں کیا تعلیم بیان ہوئی ہیں؟

۶۔ لیلۃ القدر کی فیوض و برکات پر مضمون تحریر کیجیے۔

۷۔ سورۃ الزلزال یا سورۃ العدیت یا سورۃ القارعۃ کی روشنی میں قیامت کا منظر تحریر میں لائیے

۸۔ سورۃ التکاثر یا سورۃ الھمزۃ یا سورۃ الماعون کی روشنی میں دولت سمیٹنے کی مذمت بیان کیجیے۔

---

نوعیت کی منفرد کتاب
دینی
امتیاز احمد سعید
مجید بک ڈپو
بھوانہ بازار لائلپور